Regd. L. No. 7243 Phone. 80866

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1973

سرمایہ داروں کو وارننگ

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رو سے، جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے! اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

(آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۴۳ء کے سیشن میں قائداعظم کا خطاب)

شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدل اشتراک
پاکستان
سالانہ ــــــــــ دس روپے
غیر ممالک
سالانہ ــــــــــ ایک پونڈ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

قیمت فی پرچہ
☆
ایک روپیہ

جلد (۲۶) | اکتوبر ۱۹۷۳ء | نمبر (۱۰)

فہرست

☆

۱۔ لمعات ــــــــــ ۲
۲۔ تقدیرِ اُمم ــــــــــ (محترم پرویز صاحب) ــــــــــ ۹
۳۔ مجلسِ مذاکرہ (کنونشن نومبر ۷۲ء۔ آخری قسط) ــــــــــ ۲۴
۴۔ مسئلہ قومیت ــــــــــ ۳۳
۵۔ نقد و نظر (راہِ نجات۔ اللہ کے احکام) ــــــــــ ۳۴
۶۔ سرمایہ داروں کا انجام ــــــــــ (محترم پرویز صاحب) ــــــــــ ۴۹

☆

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر سراج الحق۔ مقامِ اشاعت ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس، ایبک روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؎

لمعات

برسی بازی؟ یا برسی یا باہم بازی

ملک کے کم و بیش تمام اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ۱۱ ستمبر کو قائد اعظمؒ کی برسی نہایت احترام و عقیدت سے منائی گئی۔ یقیناً ایسا ہی ہوا ہو گا۔ اس لئے کہ پاکستان دشمن عناصر کی مذموم کوششوں کے باوجود جو ملت کے اس محسن کی عظمت کو کم کرنے کے لئے پچیس سال سے مسلسل مصروف کار رہیں، جاری ہیں، جوں جوں زمانہ گزرتا اور مختلف لیڈروں کے چہرے بے نقاب ہوتے جاتے ہیں، قائد اعظمؒ کا رخ کردار اور تابندہ اور درخشندہ ہو کر قوم کے سامنے آتا چلا جاتا ہے۔ اور ہر قلب حساس کی یہ پکار بے ساختہ لبوں پر آجاتی ہے کہ — ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے! حسن سیرت مرور زمانہ سے ماند نہیں پڑا کرتا، اور اجلتا، نکھرتا چلا جاتا ہے۔ تاج محل کبھی پرانا نہیں ہو سکتا۔

قائد اعظمؒ کی برسی کی تقریبات کے پروگراموں کی نوعیت میں اختلاف ہو سکتا ہے اور ہونا بھی چاہیے — تنوع سے تماشائے حیات کی کشش اور بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ایک بات ایسی تھی جس میں کہیں کوئی اختلاف نہیں ہوا۔ اور وہ یہ کہ ملک کے بڑے سے بڑے لیڈر سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے کارکن تک ہر ایک نے بیک زبان کہا کہ،

ہمیں قائد اعظمؒ کے پیش فرمودہ نظریات کو مشعل راہ بنانا چاہیے۔

یہ اعلانات بڑے خوش آئند اور امید افزا تھے۔ لیکن ان تقریبات کے گزر جانے کے بعد جب انسان ان پر بسکون قلب غور کرتا ہے تو یہ کرب انگیز حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان (اعلانات) کی اصل اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ (۱) یہ چند الفاظ تھے جنہیں رسمی طور پر دہرایا جاتا ہے۔ یا یہ (۲) منافقت کے وہ خوشنما، فریب انگیز پردے ہیں جن سے حقیقت کو چھپا کر عوام کو دھوکا دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ زبان سے تو یہ کچھ کہا جا رہا ہے لیکن گزشتہ پچیس سال سے ملک میں قائد اعظمؒ کے نظریات کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ اس قسم کے اعلانات محض مذاق ہیں۔

قائد اعظمؒ نے سب سے پہلے جو دعویٰ پیش کیا تھا اور جس پر مطالبہ پاکستان کی بنیاد رکھی گئی تھی وہ دو قومی نظریہ تھا۔ جیسا کہ خود ان الفاظ سے ظاہر ہے، اس نظریہ سے مفہوم یہ تھا کہ دنیا میں دو ہی قومیں بستی ہیں — ایک مسلم، اور دوسری غیر مسلم۔ اسے سمٹا کر یوں کہا جائے گا کہ اسلام میں قومیت کا معیار، ایمان کا اشتراک ہے، نہ کہ وطن کا اشتراک۔ انہوں نے ۸ مارچ ۱۹۴۴ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے

> کی بات ہے جب یہاں ہنوز مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے، وطن نہیں اور نہ ہی نسل۔ ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا۔ وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی[۱]۔ (صلہ)

وہ اس حقیقت کو بار بار دہراتے رہتے کیونکہ یہ ان کے دعویٰ کی اساس اور مطالبۂ پاکستان کی بنیاد تھی، اور اسلام کا اصل الاصول بھی۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدراس (منعقدہ ۱۹۴۱ء) میں فرمایا کہ

> مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات اور ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔

یہ تھا "دو قومی نظریہ"۔۔۔ یعنی ایک ملک میں بسنے والے مسلمان اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد نہیں ہو سکتے۔ کوئی غیر مسلم، مسلم قوم کا فرد قرار نہیں پا سکتا۔ قائد اعظمؒ کے پیش کردہ اس نظریہ کو ہم چھبیس سال سے برابر دہراتے چلے آرہے ہیں، اور عمل ہمارا یہ ہے کہ ہم نے پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دے رکھا ہے۔ یہی نہیں کہ محض نظری اور ذہنی طور پر ایک قوم قرار دے رکھا ہے، انہیں آئینی طور پر بھی ایک قوم تسلیم کر رکھا ہے۔ مشرقی پاکستان کی بغاوت اور علیحدگی کے بنیادی اسباب میں سے ایک یہی تھا کہ ہم نے وہاں کے ڈیڑھ کروڑ ہندوؤں کو مسلم قوم کے افراد قرار دے رکھا تھا۔ یہی تھے وہ ہندو جو مغربی پاکستان کے مقابلہ میں مشرقی پاکستان کی عددی اکثریت کا موجب بنتے تھے اور وہاں کے مسلمانوں کو اکساتے رہتے تھے کہ جب تم اکثریت میں ہو تو اقلیت کے اندر مدغم کیوں ہوتے ہو۔ تم اپنی الگ حکومت کیوں نہیں قائم کرتے۔ ہم "دو قومی نظریہ" کے الفاظ طوطے کی طرح رٹتے رہتے تھے اور وہ وہاں وطنی قومیت کے نظریہ کو ذہنوں میں پختہ سے پختہ تر کرتے چلے جاتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ان کا عملی نظریہ ہمارے رسمی نظریہ پر غالب آگیا۔ اور انہوں نے اپنی الگ وطنی (بلکہ نسلی) حکومت قائم کر لی۔ مغربی پاکستان میں یہی صورت اب سندھ میں پیدا کی جا رہی ہے۔ وہاں ہندو زیادہ سے زیادہ تعداد میں بسائے جا رہے ہیں۔ اور ان کا وزن وہاں کی سیاست کو دن بدن متاثر کئے جا رہا ہے۔ چنانچہ وہاں بھی وطنی قومیت کا نظریہ دن بدن شدت سے ترقی پذیر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ انجام اس کا ظاہر ہے۔

آپ نے دیکھا کہ یہاں "دو قومی نظریہ" کے ساتھ عملاً کیا ہو رہا ہے؟ لیکن مصیبت یہ ہے کہ مسلسل پریشانی اور بدنظمی کی وجہ سے قوم بھی اس قدر مایوس اور اس کی وجہ سے بے حس ہو چکی ہے کہ "دو قومی نظریہ" کے الفاظ دہرانے والوں سے کوئی نہیں پوچھتا کہ صاحب! یہ بتایئے کہ پاکستان میں کونسی "دو قومیں" بستی ہیں جن کی بنا پر آپ دو قومی نظریہ کے الفاظ الاپتے رہتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں ہوگا۔

(۴)

---

[۱] قائد اعظمؒ کی تقاریر کا اصل مجموعہ اس وقت ہمارے سامنے نہیں۔ یہ اقتباسات اس کتابچہ سے نقل کئے جاتے ہیں جو قائد اعظم کا پیغام کے عنوان سے پاکستان اکادمی لاہور کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔

"دو قومی نظریہ" کا جزو اعظم یہ اصول ہے کہ تمام مسلمان محض مسلمان ہونے کی جہت سے ایک قوم ہیں۔ مسلمان کسی نسبت سے بھی مختلف قوموں میں نہیں بٹ سکتے۔ قائد اعظم نے (۱۷) اپریل ۱۹۴۸ء کو پشاور میں قبائلی سرداروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ

> ہم مسلمان ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب پر یقین رکھتے ہیں۔ بس یہ لازمی اور ناگزیر ہے کہ ہم ملت کی حیثیت میں بھی ایک ہوں۔ (قائد اعظم کا پیغام۔ ص ۲۳۵)

انہوں نے ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام (بحیثیت گورنر جنرل پاکستان) اپنے براڈکاسٹ میں پہلے یہ فرمایا کہ

> مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان سے قریب ایک ہزار میل کے فاصلے پر ہے اور ان کے درمیان مملکتِ ہند کا علاقہ حائل ہے۔ بیرونی ممالک کے ایک طالب علم کے دل میں جو پہلا سوال ابھرے گا وہ یہ ہوگا کہ ایسی مملکت کا قیام کس طرح ممکن ہوگا۔ ایسے دو خطوں میں جن میں اس قدر بُعد ہو، وحدتِ حکومت کس طرح ممکن ہوگی۔ میں اس سوال کا جواب صرف ایک لفظ میں دوں گا۔ اور وہ یہ کہ
>
> ایسا ہمارے ایمان کی رُو سے ہوگا۔ ایمان خدا پر۔ ایمان اپنے آپ پر۔ ایمان اپنے مستقبل پر۔
>
> لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ ہم سے اچھی طرح واقف نہیں وہ ایسے مختصر جواب کا پورا پورا مفہوم سمجھ نہیں سکیں گے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل بھی بیان کر دوں۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا۔

> پاکستان کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے ارکان ہیں جس میں حقوق، شرف و تکریم، اور احترامِ ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنابریں ہم میں اخوت اور وحدت کا بڑا گہرا جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات۔ ہم اپنے نظریاتِ زندگی، نقطۂ نگاہ اور احساسات و مدرکات کے مالک ہیں اور یہی وہ عوامل ہیں جو قومیت کی تشکیل کا معیار بنتے ہیں۔ (ان بنیادوں پر ہم ایک قوم بنتے ہیں)

جو عوامل وحدتِ ملّی کی راہ میں رکاوٹ بنتے اور قوم میں تفرقہ پیدا کرتے تھے، ان کی انہوں نے واضح الفاظ میں نشاندہی کر دی۔ انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ کی اپنی مشہور تقریر میں فرمایا۔

> میں چاہتا ہوں کہ اب آپ بنگالی، پنجابی، سندھی، بلوچی اور پٹھان وغیرہ کی اصطلاحوں میں بات نہ کریں۔ ہم پنجابی، سندھی، پٹھان وغیرہ نہیں ہم سب مسلمان ہیں۔ اسلام نے ہمیں یہی سبق دیا ہے۔ اب آپ باقاعدہ ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب آپ نے ایک وسیع علاقہ اپنے تسلط میں کر لیا ہے جو آپ کا اپنا ہے۔ یہ نہ پنجابیوں کا ہے نہ سندھیوں کا، نہ پٹھانوں کا ہے نہ بنگالیوں کا۔ یہ آپ کا ہے۔۔۔۔ اگر آپ خود کو ایک قوم، ایک عظیم قوم کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں تو خدا کے لئے اس صوبائی عصبیت کو فوراً ترک کر دیجئے۔ صوبائی عصبیت بھی سنّی، شیعہ وغیرہ کی فرقہ داری کی طرح ایک بہت بڑی لعنت ہے۔ (قائد اعظم

پھر انہوں نے ۲۸ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ ہی سے اپنی نشریاتی تقریر میں فرمایا۔

اگر ہم خود کو بنگالی، پنجابی اور سندھی وغیرہ پہلے اور مسلمان اور پاکستانی بعد میں سمجھنے لگیں گے تو پھر پاکستان لازما پارہ پارہ ہو جائے گا۔ اسے کوئی معمولی بات قرار دے کر ٹال دینے نہیں۔ اس کی شدت اور امکانات سے ہمارے دشمن بخوبی آگاہ ہیں اور میں آپ کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ پہلے ہی اس سے غلط فائدہ اٹھانے میں مصروف ہیں۔ میں آپ سے صاف صاف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب بھارت کی سیاسی ایجنسیاں اور وہاں کے اخبارات جنہوں نے پاکستان کو وجود میں آنے سے روکنے کے لئے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا، اب اچانک مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے "دوست" بن کر یہ کہتے ہیں کہ آپ کے مطالبات "جائز ہیں"؛ تو کیا آپ کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کیسی خطرناک شرارت بلکہ سازش آپ کے خلاف کی جا رہی ہے؟ کیا یہ امر اپنی جگہ بالکل واضح نہیں کہ بھارت کی یہ سیاسی ایجنسیاں مسلمانوں کو پاکستان حاصل کرنے سے نہ روک سکیں تو اب یہ پاکستان کا شیرازہ اپنے دوسرے ہتھکنڈوں اور پُرفریب پراپیگنڈہ سے بکھیرنے پر تلی ہوئی ہیں اور اس کے لئے انہوں نے وہی پرانا طریقہ اختیار کیا ہے جو مسلمانوں کے دوسرے دشمن اختیار کرتے رہے ہیں یعنی انہوں نے ایک مسلمان بھائی کو دوسرے مسلمان بھائی کے خلاف اکسانا شروع کر دیا ہے۔ میں آپ کو صوبائی عصبیت کے اس زہر سے خبردار کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے دشمن ہماری مملکت میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ (ص ۱۵۶)

اسی طرح انہوں نے ۱۵ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ میونسپلٹی کے استقبالیہ کے جواب میں فرمایا۔

اب ہم سب پاکستانی ہیں۔ نہ بلوچی۔ نہ پٹھان۔ نہ سندھی۔ نہ بنگالی۔ نہ پنجابی۔ ہمیں پاکستانی اور صرف پاکستانی کہلوانا چاہیئے۔ (ص ۱۷۱)

یہ تھے قائد اعظمؒ کے نظریات۔ ان نظریات کے الفاظ ہم مسلسل دہراتے رہے اور صوبائی عصبیت کا زہر برابر پھیلتا چلا گیا۔ اس شجرۃ الزقوم کا پہلا پھل مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں سامنے آ گیا۔ وہاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اب یہی زہر مغربی پاکستان میں (یوں کہیئے کہ پہلے اندر ہی اندر اور اب کھلے بندوں) پھیلایا جا رہا ہے۔ مشرقی پاکستان ایک صوبہ تھا اس لئے وہاں ایک الگ قوم کا تصور ابھارا گیا۔ مغربی پاکستان میں چار صوبے ہیں اس لئے یہاں چار قومیتوں کا نظریہ بلند کیا جا رہا ہے۔ پہلے بنگالی الگ ہوئے۔ اب کہا جاتا ہے کہ مغربی پاکستان میں چار قومیں بستی ہیں۔ اس کے بعد سوچئے کہ "پاکستانی قوم" کا کہیں وجود بھی باقی رہتا ہے؟ بنگالیوں نے اپنے آپ کو الگ قوم قرار دیا تھا تو مشرقی پاکستان ختم ہو گیا تھا۔ اب مغربی پاکستان میں چار الگ الگ قومیں تسلیم کر لی گئیں تو سارا پاکستان ہی ختم ہو جائیگا۔ آپ ذرا غور کیجئے کہ۔

(۱) اسلام نے اشتراکِ ایمان کو معیارِ قومیت قرار دیکر، دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیا۔

(۲) مغرب نے اشتراکِ وطن (اشتراکِ مملکت) کو معیارِ قومیت قرار دیکر ایک مملکت کے باشندوں کو ایک قوم قرار دیا۔ ہمارے نیشنلسٹ بھائی تقسیم سے پہلے ہندوستان میں اسی نظریہ کے قائل تھے، اس لئے ہندوستان کے تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دینے کے مدعی تھے۔

(۳) اب وہی حضرات پاکستان میں نہ اشتراکِ ایمان کو معیارِ قومیت قرار دیتے ہیں نہ اشتراکِ مملکت کو اب

یہ نسلی یا لسانی یا صوبائی تفریق کی بنا پر، الگ الگ قومیتوں کے دعویدار ہیں۔

"قوم" کے منفرد تشخص اور سیاسی پوزیشن سے ایک دنیا واقف ہے۔ ہم ان حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ایک مملکت کے اندر "قومیتوں" کی سیاسی پوزیشن کیا ہوگی؟ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ محض لفظی فریب دہی ہے، ورنہ مملکت میں جداگانہ قومیتوں کے معنی کچھ نہیں۔ ان سے مراد جداگانہ "قومیں" ہی ہیں جن کی بنا پر اگلا قدم، جداگانہ مملکتوں کا مطالبہ ہوگا۔ مشرقی پاکستان میں بھی تو یہی کچھ ہوا تھا۔

ہم پوچھنا چاہتے ہیں قائداعظمؒ کے نظریات کو مشعلِ راہ بنانے کے مدعیوں سے کہ کیا مملکت کے اندر مختلف قومیتوں کا تصور، قائداعظمؒ کے (ملتِ واحدہ کے) تصور کی کھلی ہوئی مخالفت، اور مملکت کے خلاف بغاوت کی طرف پیش قدمی نہیں؟ اگر ایسا ہے تو ان تصورات کو ملک میں عام ہونے دینا، اور قائداعظمؒ کے نظریات کے راگ الاپنا، قائداعظمؒ کی یاد کی توہین نہیں تو اور کیا ہے؟

قائداعظمؒ نے کیبنٹ مشن پلان کے سلسلہ میں بیان دیتے ہوئے (۲۳ مئی ۱۹۴۶ء) کو فرمایا تھا کہ

مسلم لیگ کی پوزیشن یہ ہے کہ مشرق میں بنگال اور آسام، اور مغرب میں پنجاب، سرحد، سندھ، اور بلوچستان مل کر ایک آزاد خود مختار مملکت بنیں گے۔

پھر انہوں نے تشکیلِ پاکستان کے بعد بحیثیت گورنر جنرل، آسٹریلیا کے نام اپنی نشری تقریر میں (۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو) فرمایا تھا کہ

پاکستان دو قطعات پر مشتمل ہے۔ ایک شمال مغرب میں واقع ہے دوسرا شمال مشرق میں۔

یعنی پاکستان ایک مملکت تھا جس میں مشرقی پاکستان کی حیثیت ایک صوبے کی تھی۔ اس صوبے نے مملکت سے بغاوت کی اور اسے ایک جداگانہ آزاد مملکت قرار دیدیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن اس طرح وجود میں لائی ہوئی مملکت کے سربراہ ہونے کے مدعی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا شیخ مجیب الرحمٰن مملکتِ پاکستان کا باغی نہیں؟ اور اگر ایسا ہے تو اس کے خلاف کیا اقدامات کئے گئے ہیں؟ ایک مملکت کے اندر اپنی الگ مملکت قائم کر لینا کوئی معمولی جرم نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت وہ ہماری گرفت سے باہر ہے، لیکن بغاوت جیسے جرم کے مقدمات تو ملزم کی عدم موجودگی میں بھی چلائے جا سکتے ہیں۔ یا کیا تصور یہ ہے کہ اگر باغی ناکام رہ جائے تو وہ سختی دار و رسن ہوتا ہے، اور کامیاب ہو جائے تو اس کی بغاوت جائز قرار پاجاتی ہے؟ ایسا تصور تو بڑا خطرناک ہے!

قائداعظمؒ نے مسلم سٹوڈنٹس کانفرنس جالندھر کے اجلاس منعقدہ ۱۵ نومبر ۱۹۴۲ء میں طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے پہلے فرمایا۔

جب تک آپ طالب علم ہیں آپ اپنی کوشش کو محض تیاری پر محدود رکھیں اور عملی سیاست میں حصہ نہ لیں۔

بعد میں اس فقرہ کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔

میں نے ابھی کہا ہے کہ آپ عملی سیاست میں حصہ نہ لیں۔ میں اس کی وضاحت کرتا ہوں تاکہ غلط فہمی کا اندیشہ نہ رہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنے اندر وہ اوصاف پیدا کریں جن کے وسیلے سے آپ طالبعلمی کی زندگی ختم کرنے کے بعد عملی سیاست کی جدوجہد میں کامیاب ہوں۔ آپ اس وقت اپنے آپ کو تیار اور ضروری ساز و سامان یعنی علم و آگہی اور توفیقِ عمل سے آراستہ کریں۔ آپ کی اولین اور اہم ترین ضرورت ہے مطالعہ۔ مطالعہ۔ مطالعہ۔ (ص۱۴۹)

پھر آپ نے تشکیلِ پاکستان کے بعد ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

میرے نوجوان دوستو! میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کسی سیاسی جماعت کے آلۂ کار بن گئے تو یہ آپ کی سب سے بڑی غلطی ہوگی۔

اور پھر ۲۴ مارچ کو جلسۂ تقسیم اسناد ڈھاکہ یونیورسٹی میں فرمایا۔

آپ کی بھلائی، آپ کے والدین کی بھلائی بلکہ ساری مملکت کی بھلائی اس میں ہے کہ آپ کی توجہ صرف تحصیلِ علم کے لئے وقف رہے۔ (ص۱۴۰)

ہم پوچھنا چاہتے ہیں قائداعظم کے نظریات سے روشنی حاصل کرنے کے مدعیوں سے کہ آپ نے طالب علموں کی زندگی کو تحصیلِ علم تک محدود رکھنے اور انہیں عملی سیاست میں حصہ لینے، یا کسی ایک پارٹی کا آلۂ کار بننے سے روکنے کے لئے کیا کیا ہے؟

(۴)

قائداعظم نے ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کو کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

اسلام میں 'انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں۔ مساوات' آزادی اور اخوت' اسلام کے اساسی اصول ہیں۔ (ص۵۳)

ہم قائداعظمؒ کی برسی کی تقریبات پر بیانات اور پیغامات دینے والے حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا قائداعظمؒ کے قائم کردہ پاکستان' میں یہ کیفیت ہے کہ انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں' اور یہاں مساوات' آزادی اور اخوت کے اسلامی اصولوں پر عمل ہو رہا ہے؟ اگر نہیں ہو رہا تو اس قسم کے بیانات و پیغامات سے کیا حاصل ہے؟ کیا ان سے قائداعظمؒ کی روح یہ سمجھ کر خوش ہو جائے گی کہ میں نے اسلام کے جو اصول قوم کو دیئے تھے' ان پر قوم عمل پیرا ہو رہی ہے۔؟

(۵)

اسلام کی بات آگئی تو قائداعظمؒ کا وہ زریں اصول سامنے آگیا جسے ان صفحات پر سینکڑوں بار دہرایا جا چکا ہے۔ انہوں نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن حکیم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں' قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا ہماری سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کا یہی نقشہ ہے! اس کے جواب میں کہہ دیا جائے گا کہ پاکستان کے آئین میں یہ شقیں موجود ہیں کہ (۱) مملکت کا مذہب اسلام ہو گا۔ (۲) مملکت کا ضابطہ قوانین کتاب و سنت کے مطابق ہو گا۔ اور (۳) مملکت خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے کاروبارِ حکومت سرانجام دیگی۔ یہ درست ہے کہ یہ شقیں آئین میں موجود ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان شقوں کا عملی مفہوم کیا ہے اور ان پر عمل کس حد تک ہو رہا ہے! جہاں تک شقِ اول کا تعلق ہے، آج تک نہ کسی نے بتایا ہے اور نہ ہی کوئی بتا سکتا ہے کہ ان الفاظ "مملکت کا مذہب اسلام ہی" کا مفہوم کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جب ان الفاظ کا مفہوم ہی متعین نہیں تو ان پر عمل کیسے ہو سکے گا۔

جہاں تک دوسری شق کا تعلق ہے، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب واضح الفاظ میں کہہ چکے ہیں (اور کسی نے ان کی تردید نہیں کی) کہ کتاب و سنت کی رو سے کوئی ضابطہ قوانین ایسا مرتب نہیں کیا جا سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک متفقہ طور پر اسلامی کہلا سکے۔ ذرا سوچئے کہ اس کے بعد آئین کی یہ شق کوئی عملی شکل اختیار کر سکتی ہے؟

باقی رہی تیسری شق، تو آئین میں کہیں اس کی تصریح نہیں کہ وہ حدود اللہ کون سی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے مملکت اپنا کاروبار سرانجام دیگی! ان حدود کے تعین کے بغیر اس شق کے الفاظ، جوٹے نگوں کی مینا کاری سے زیادہ کیا حیثیت رکھتے ہیں۔

ہمارا دین صدیوں سے چند بے روح رسومات ادا کرنے اور (بلا سمجھے) کچھ الفاظ دہرا دینے کا مجموعہ بن کر رہ گیا تھا۔ اب ہماری سیاست بھی کچھ رسمی تقریبات منانے اور چند بے معنی بیانات شائع کرنے تک محدود ہو چکی ہے۔ تباہی کے قریب پہنچنے والی قومیں اپنی مہلت کے وقفہ کو اسی قسم کی مہملات میں ضائع کر دیتی ہیں۔ انہی کے متعلق کہا گیا ہے کہ فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ۔ (۴۳)۔ انہیں اسی قسم کی بیانبازیوں اور کھیل تماشوں میں الجھا رہنے دے تا آنکہ یہ اپنے وقتِ موعود تک پہنچ جائیں۔

———— (۰) ————

(۲)

حالیہ سیلاب، اپنے جلو میں جو عالمگیر تباہیاں اور اپنے عواقب میں جو روح فرسا بربادیاں لے کر آئے ہیں، ان کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ سیلاب کا روکنا تو کسی کے بس میں نہیں تھا، البتہ جو لوگ ان تباہیوں سے محفوظ ہیں، ان پر بڑی گراں بار ذمہ داریاں عاید ہو گئیں۔ اس قسم کے عالمگیر مصائب میں مستحقین کی امداد کا طریق کار، قرآن یہ بتاتا ہے کہ اس کا آغاز اپنے قریبی حلقوں سے کیا جائے۔ (اقربین کے معنی رشتہ دار ہی نہیں بلکہ قریب و جوار کے رہنے والے بھی ہیں)۔ اس کا بنیادی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بالتحقیق معلوم کر سکتا ہے کہ کون کون فی الواقعہ امداد کا مستحق ہے اور مطلوبہ امداد صحیح مقام پر پہنچ رہا ہے۔ ہم نے اس سلسلہ میں یہی طریق اختیار کیا۔

قوم نے جس ہمت اور استقلال سے اس حادثہ کا مقابلہ کیا وہ قابلِ داد ہے۔ لیکن سب سے زیادہ مستحقِ تحسین و تبریک ہیں ہماری افواج قاہرہ کے مجاہدین، جنھوں نے دن رات ایک کر کے اس تباہی کو روکا، اور اس طرح کہ — نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی امید — اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ شاد کام و کامران رکھے۔ انہی سے قوم کو زندہ رہنے کا سہارا مل رہا ہے۔

———— (۰) ————

تقدیرِ اُمم

پرویز

(گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را)

[آج آپ کو اہلِ پاکستان کی زبان سے اس قسم کے فقرات عام سنائی دیں گے ـــــ ہمارا حشر کیا ہوگا؟ اس قوم کا انجام کیا ہوگا؟ یہ ملک بچ سکیگا یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ کیفیت انتہائی مایوسی کی عکاس ہے اور قوموں کی زندگی میں مایوسی، ان کی تباہی کی علامت۔ یہ فقرات تو آپ ہر ایک کی زبان سے سُنیں گے لیکن اس کے اسباب و علل کے متعلق آپ کے سامنے مختلف خیالات آئیں گے۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر جو ایسے وقت میں "خدا کی مرضی" یا "ہماری تقدیر" کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے اور اسطرح خواب آور گولیوں سے خودکشی کر لیتے ہیں، ان لوگوں کی طرف آجائیے جو حالات کا تجزیہ کرنے کا دعوےٰ کرتے اور لمبی چوڑی بحثوں میں الجھے رہتے ہیں، تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی بات بھی چند ہنگامی وجوہات، اتفاقی حادثات یا سیاسی تغیرات سے آگے نہیں بڑھتی ـــ اور ان کی بنیاد باہمی الزام تراشیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتی ـــ یعنی یہ کہ یہ سارا بگاڑ فریقِ مقابل کا پیدا کردہ ہے۔ لیکن طلوعِ اسلام تو ہر معاملہ کے لئے قرآن کریم کی بارگاہ سے راہ نمائی طلب کرتا ہے۔ وہ ' قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کیا بتاتا ہے' اور ان کی موت و حیات سے متعلق قوانین کی صراحت کس طرح سے کرتا ہے' اس باب میں ہم شروع سے لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ لیکن وقت کا تقاضا ہے کہ ان حقائق کو بار بار قوم کے سامنے لایا جائے تاکہ اس کی توجہ ہنگامی اسباب و علل سے ہٹ کر بنیادی اور اساسی وجوہات کی طرف منتقل ہو' اور وہ اس طرح اس آنے والی تباہی سے بچنے جانے کی صحیح تدبیر کر سکے۔ قرآن ہمیں پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

صورت گری را از من بیاموز		شاید کہ خود را باز آفرینی ۔

طلوعِ اسلام]

قرآن کریم نے خدا کا جو تصور دیا ہے اس کی رُو سے اس نے ایسے قوانین متعین کر دیئے ہیں جن کے مطابق کائنات کا یہ عظیم سلسلہ سرگرمِ عمل ہے۔ اسی قسم کے قوانین اس نے انسانی دنیا کے لئے بھی مقرر کر رکھے ہیں۔ انسانی دنیا میں ایک تو افراد کی زندگی ہے۔ ان قوانین کا اطلاق ایک فرد کی طبیعی زندگی اور اس کی ذات کی نشوونما دونوں پر ہوتا ہے لیکن اس سے کہیں اہم اقوام کی زندگی ہے۔ قوم اگرچہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے لیکن اس کی نفسیات منفرد اور مختص ہوتی ہیں۔ قرآن نے وہ قوانین

بھی دیئے ہیں جن کے مطابق قوموں کے عروج و زوال اور ان کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ اگر ایک قوم خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے۔ یعنی وہ ایسا نظام اور معاشرہ متشکل کرتی ہے۔ جس کی بنیادیں خدا کے مقرر کردہ قوانین پر استوار ہوں، تو اس قوم کو سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہوتی ہیں۔ اور اگر وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرے تو وہ تباہ اور برباد ہو جاتی ہے۔ اس کا نام اجتماعی قانونِ مکافاتِ عمل ہے' اور یہ اسی طرح اٹل اور غیر متبدل ہے جس طرح افراد کے لئے قانونِ مکافات۔ قرآن کی رُو سے تاریخ اسی اجتماعی قانونِ مکافات کے ریکارڈ کا نام ہے۔ یعنی وہ یہ بتاتی ہے کہ فلاں قوم نے فلاں نظریۂ زندگی کے مطابق معاشرہ قائم کیا تو اس کا یہ انجام ہوا۔ اور فلاں قوم نے فلاں نصب العین حیات کے مطابق زندگی

تاریخ کی اہمیت

بسر کی تو اس کا مآل یہ ہوا۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے "سائنس آف ہسٹری" یا "فلاسفی آف ہسٹری" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن تاریخ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اتنی اہمیت کہ وہ تاریخ کو اپنے دعاوی کی صداقت کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ جب ہم نے کہا ہے کہ جو قوم اس انداز کی زندگی بسر کرے گی وہ تباہ و برباد ہو جائے گی تو اس دعوے کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ تم تاریخ الانسانیت پر غور کرو اور دیکھو کہ جس جس قوم نے، جس جس ملک اور جس جس زمانے میں یہ روش اختیار کی، اس کا انجام تباہی اور بربادی ہوا یا نہیں۔ قرآنی دعاوی (یا خدا کے اٹل قوانین) کو پرکھنے کے لئے یہ ایک ایسا معیار ہے جو ساری دنیا کے لئے کھلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنے متبعین کو خاص طور پر تاکید کی ہے کہ وہ تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو قرآنی دعاوی کی صداقت کے شواہد ان کے سامنے آجائیں گے اور دوسرے وہ اس بات کا اندازہ کرتے رہیں گے کہ ان کا کوئی قدم غلط راستے کی طرف تو نہیں اٹھ رہا۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ ہم نے تمہاری راہ نمائی کے لئے قرآن میں دو چیزیں دی ہیں۔ وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ

قرآن اور تاریخ

الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِکُمْ (۲۴/۳۴)۔ یعنی ایک تو وہ واضح قوانین جن کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں اور دوسرے اقوامِ سابقہ کے احوال و کوائف (تاریخ) جن سے ان قوانین کی صداقت پرکھی جا سکتی ہے۔ آپ قرآن کو دیکھئے۔ اس میں اقوامِ سابقہ کے احوال و مآل اس تفصیل و تکرار سے دیئے گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ تاریخ کی کتاب ہے۔ لیکن وہ تاریخ کی کتاب نہیں۔ اس کا انداز یہ ہے کہ وہ پہلے ان قوانین کو بیان کرتا ہے۔ جو قوموں کے عروج و زوال کو متعین کرتے ہیں، اور اس کے بعد اقوامِ گذشتہ کے حالات سامنے لا کر یہ بتاتا ہے کہ دیکھو ان قوانین نے اپنا اٹل نتیجہ کس طرح مرتب کیا۔ اور پھر اس سے توجہ فوراً اس طرف مبذول کرا دیتا ہے کہ اگر تم نے بھی اسی قسم کی روش اختیار کی تو تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔ وہ قرآن کے نظامِ حق و صداقت کے مخالفین کے متعلق کہتا ہے کہ اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا ...... بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۴۰/۸۲) کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں کہ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہو

قوموں کا انجام

گذری ہیں، اور انہوں نے ان کی طرح غلط روش اختیار کی تھی، ان کا انجام کیا ہوا؟ ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریاں، ان کی عظمتِ گذشتہ کی داستانیں پکار پکار کر دہرا رہی ہیں۔ وہ قومیں تعداد میں بھی ان سے زیادہ تھیں (جو اب اس نظام کی مخالفت کر رہے ہیں) اور قوت میں بھی بڑھ کر۔ ان کی قوت و شوکت کے جھنڈے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ لیکن جب ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج کے ظہور کا وقت آیا تو نہ ان کی تعداد کی کثرت ان کے کسی کام آسکی اور نہ ہی دولت و قوت انہیں اس تباہی سے بچا سکی۔ ان پر یہ تباہی اچانک نہیں آگئی تھی۔ خدا نے پہلے ان کی طرف اپنے پیغامبروں کو بھیجا تاکہ وہ انہیں تنبیہ کر دیں (warning دے دیں) کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو وہ تمہیں تباہی

کے جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے۔ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ ..... كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۰/۸۳) لیکن جب خدا کے پیغامبران کی طرف ایسے واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ ہم جس طریق پر چلے جا رہے ہیں، اس سے مطمئن ہیں۔ وہ ہمیں مسرتوں کے جھولے جھلا رہا ہے۔ تم خواہ مخواہ کہہ رہے ہو کہ ہم پر تباہیاں آ رہی ہیں لیکن آخر الامر انہیں اس تباہی نے آگھیر لیا جس کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ (۴۰/۸۴) جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو اس وقت کہنے لگے کہ ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور جن قوتوں کو ہم اس کا ہمسر ٹھہرایا کرتے تھے ان سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن فَلَمْ يَكُ ..... بَاْسَنَا (۴۰/۸۵)، جب غلط روش کے نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں تو اس وقت اس سے اجتناب کرنا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اور یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہ تھی جو صرف انہی کے ساتھ مختص تھی۔ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ ..... الْكٰفِرُوْنَ۔ (۴۰/۸۵) یہ خدا کا اٹل قانون ہے جس کے مطابق تمام اقوام سابقہ کی موت و حیات کے فیصلے ہوئے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں حق و صداقت کی روش سے انکار کرنے والے نقصان میں رہتے ہیں۔

دوسرے مقام پر ہے۔ وَكَمْ ..... قَوْمًا اٰخَرِيْنَ۔ (۲۱/۱۱) کتنی ہی بستیاں ایسی تھیں جنہوں نے ظلم و استبداد کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ ہم نے انہیں (ان کی غلط روش کے نتیجے میں) ہلاک کر دیا۔ اور ان کی جگہ دوسری قوم لے آئے۔ اس (تباہ ہونے والی قوم) کی حالت یہ تھی کہ انہیں ان کی غلط روش کے نتائج سے بار بار آگاہ کیا گیا لیکن انہوں نے ایک نہ سنی۔ لیکن فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ۔ (۲۱/۱۲) جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں سامنے دیکھ لیا تو اس سے

قانونِ مکافات کی گرفت

بھاگنے لگے۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکار کر کہا کہ لَا تَرْكُضُوْا بھاگو نہیں تم بھاگ کر جا کہاں سکتے ہو؟ وَارْجِعُوْٓا ..... تُسْـَٔلُوْنَ۔ (۲۱/۱۳) چلو واپس اپنے محلات کی طرف اور اس ساز و یراق کی طرف جو تمہارے لئے اس قدر آسائشیں بہم پہنچاتا تھا۔ واپس چلو تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ اتنا مال و دولت تم نے کہاں سے لیا تھا؟ وہ مظلوم کون تھے جن کے خونِ ناحق کی رنگینی تمہارے محلات کے لئے وجہ آرائش بنی تھی۔ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲۱/۱۴) اس پر وہ پکار اٹھے کہ ہم واقعی بہت ظلم و ستم کیا کرتے تھے۔ یہ تمام ساز و سامان اُسی ظلم و ستم کا نتیجہ ہے۔ فَمَا زَالَتْ ..... خٰمِدِيْنَ (۲۱/۱۵) وہ یہی پکارتے رہے لیکن ان کی اس وقت کی پکار انہیں کچھ فائدہ نہ دے سکی۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل نے انہیں ایسا کر دیا جیسے کٹے ہوئے کھیت (اور) بجھے ہوئے شعلے ہوں۔

مذکورہ بالا آیت (۲۱/۱۲) میں کہا گیا ہے کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ "جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں، سامنے دیکھا۔ جب انہیں اس کا احساس ہوا"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ غلط نظامِ تمدن و معاشرت اپنے تباہ کن نتائج روزِ اول ہی سے مرتب کرنا شروع کر دیتا ہے لیکن وہ اثرات غیر محسوس ہوتے ہیں اور انہیں صرف وہی آنکھ دیکھ سکتی ہے جس پر مفاد پرستیوں کے پردے نہ پڑے ہوں۔ یہ نتائج اندر ہی اندر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ تا آنکہ ایک دن محسوس شکل میں سامنے آ جاتے ہیں۔ محسوس شکل میں سامنے آنے کے معنی ہوئے کہ اکثر تباہی ایسے اسباب و ذرائع سے ہوتی ہے جو محسوس طور پر نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ اسباب ان کے

تباہی کا اصلی سبب

غلط نظام کے تباہ کرنے کا فقط ذریعہ (INSTRUMENT) ہوتے ہیں۔ اس کا اصلی سبب (REAL CAUSE) تو ان کی غلط روشِ زندگی ہوتی ہے۔ وقائع نگار ان کے نزدیک

تاریخ فقط واقعات و حوادث کے ریکارڈ کا نام ہے) ان محسوس اسباب کو ان کی تباہی کا سبب قرار دیدیتے ہیں۔ لیکن قرآن، جو تاریخ کو ایک سائنس یا فلسفہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، ان واقعات و حوادث (یعنی ظاہری اسباب) کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ وہ علامات مرض کی بجائے علتِ مرض کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ان کی تباہی کا حقیقی سبب وہ تھا۔

آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قرآن نے اس قانون کو جس رُو سے قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔

سنت اللہ

"سنت اللہ" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں "خدا کی عادت" اور اس سے مراد ہے وہ قانونِ مکافاتِ عمل جو شروع سے یکساں چلا آتا ہے اور غیر متبدل ہے۔ فطرت کے تمام قوانین "سنت اللہ" ہیں۔ جن میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ سورۂ احزاب میں ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ ..... قَدْرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳) "یہ اللہ کی عادت ان لوگوں کے متعلق تھی جو اس سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ اللہ کی عادت کیا؟ یہ اس کا فیصلہ ہے جو ایک اٹل قانون کی شکل اختیار کر چکا ہے"۔ اسی سورت میں ذرا آگے چل کر ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ ..... تَبْدِيْلًا (۳۳) یہی قانون خداوندی ہے جس نے اقوامِ سابقہ کی تقدیروں کے فیصلے کئے تھے۔ تو قانون خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا"۔ اسی طرح سورۂ فاطر میں، اقوامِ سابقہ کے احوال و ظروف اور انجام و عواقب کے سلسلے میں کہا کہ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّةَ الْاَوَّلِيْنَ (۳۵) "یہ لوگ جو اس نظامِ خداوندی کی مخالفت کر رہے ہیں، انہیں اس کے سوا اور کسی چیز کا انتظار نہیں کہ خدا کے جس قانون کے مطابق اقوامِ گزشتہ کے فیصلے ہوئے تھے اسی قانون کا ان پر اطلاق ہو جائے"۔ سو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا کا وہی قانون ان پر بھی منطبق ہو کر رہے گا۔ اس لئے کہ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (۳۵) تو نہ تو خدا کے قانون میں کوئی تبدیلی پائے گا اور نہ ہی ایسی صورت ہو سکے گی۔ کہ جب وہ قانون آجائے تو کوئی اُس کا رُخ کسی دوسری طرف پھیر دے۔

ہیگل اور مارکس کا فلسفۂ تاریخ

ہمارے زمانے میں ہیگل (HEGEL) نے (اور اس کے تتبع میں مارکس (MARX) نے تاریخ کو ایک فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ لیکن ان کا فلسفہ تاریخ کیا ہے؟ ہیگل نے کہا کہ ایک تصور (IDEA) پیدا ہوتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ جب شباب تک پہنچتا ہے تو اس میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس میں سے اس کی ضد ایک دوسرا تصور نمودار ہو جاتا ہے۔ اسکا بھی یہی حشر ہوتا ہے اور اس میں سے ایک اور تصور پیدا ہو جاتا ہے۔ جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ ساری تاریخ انہی متضاد تصورات کی کشمکش کی داستان ہے۔ مارکس نے بھی یہی کہا، اس تبدیلی کے ساتھ کہ یہ جنگ تصورات کی نہیں بلکہ نظامہائے معیشت (ECONOMIC SYSTEMS) کی ہے۔ ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے پھر اس میں سے اس کی ضد ایک اور نظام نمودار ہوتا ہے۔ جو پہلے نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ جب ہیگل سے پوچھا گیا کہ اس ربط و نظم کے ساتھ یہ سلسلۂ کشمکش کس قوت کی بنا پر جاری و ساری ہے تو اس نے کہا کہ یہ "روحِ زمانہ" (ZEITGEIST) کی کارفرمائی ہے۔ اور جب یہی سوال مارکس سے کیا گیا تو اس نے کہا کہ اس کا سبب تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) ہے

تاریخ کے اس فلسفہ کی رُو سے نہ کائنات کے سامنے کوئی مقصد اور منزلِ مقصود ہے۔ نہ کوئی تصور فی نفسہٖ خیر یا شر ہے۔

نہ کسی تصوّر یا نظام میں آگے بڑھنے اور باقی رہنے کی صلاحیت ہے۔ نہ ہی اس تمام کارگہِ ہست و بود کے پیچھے کوئی ایسی قوت ہے جو اس عظیم سلسلہ کو کسی مقصد کے مطابق چلا رہی ہو۔ کچھ اندھی قوتیں ہیں جو میکانکی طور پر مصروفِ کشمکش ہیں۔ اور بے کس و بے بس انسان ان تصادمات بے معنی اور تزاحماتِ بے مقصد میں خواہ مخواہ پستا چلا جا رہا ہے۔

قرآنی فلسفۂ تاریخ

لیکن قرآن نے جو فلسفۂ تاریخ پیش کیا ہے وہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات میں حق اور باطل کی کشمکش پیہم جاری ہے۔ حق، اٹل، مستحکم اور غیر متبدل ہے اور اس کا نتیجہ تعمیر و ارتقاء۔ اس کے برعکس، باطل مرغ باد نما کی طرح ہر آن بدلنے والا ہے۔ اور اس کا نتیجہ تخریب و تنزل ہے۔ حق و باطل کی اس کشمکش میں آخر الامر حق غالب آتا ہے۔ اس لئے کہ باطل پر غلبہ حاصل کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ۔ (۲۱/۱۸) ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں اور اس کی ضرب ہائے پیہم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فَيَدْمَغُهٗ حق باطل کا سر توڑ دیتا ہے۔ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔ پس وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ (۲۱/۱۸) تم لوگ اس نظریہ کے خلاف جو کچھ بیان کرتے ہو، اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ کشمکش حق و باطل اور آخر الامر حق کا غلبہ اور باطل کی شکست، ہوتی کس مقصد کے لئے ہے؟ اور اس کے پیچھے کون سی قوت کارفرما ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ خدا نے یہ سلسلہ کائنات بالمقصد پیدا کیا ہے۔ یونہی بیکار پیدا نہیں کیا۔

کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے

سورۃ الدخان میں ہے کہ: مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ ... لٰعِبِيْنَ (۴۴/۳۸) ہم نے کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کو یونہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ مَا خَلَقْنٰهُمَآ ..... لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۴/۳۹) ہم نے اسے حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ کائنات یونہی وجود میں آگئی ہے اور بلا مقصد سرگرم عمل ہے۔ یہ تصوّر غلط ہے۔ کائنات کی تمام قوتیں اس لئے سرگرمِ عمل ہیں کہ ہر عمل اپنا صحیح صحیح نتیجہ مرتب کرے۔ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ .... بِالْحُسْنٰى (۵۳/۳۱) تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں، ان کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ دکھائے۔ اور جو لوگ ہمواریاں اور خوشگواریاں پیدا کرتے ہیں انہیں اچھا بدلہ ملے۔

چونکہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے اس لئے ہر وہ تصوّر۔ ہر وہ عمل۔ ہر وہ نظامِ زندگی جو حق (مستقل اقدار) کے مطابق ہوگا وہ زندہ رہے گا، اور آگے بڑھے گا۔ جو اس کے خلاف جائے گا اور تعمیر انسانیت کے لئے مضر ہوگا وہ تباہ ہو جائے گا۔ اس مقام پر ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ہمارا روزمرّہ کا تجربہ اس کے خلاف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ظالموں کی کھیتی پنپتی ہے اور جو لوگ عدل و دیانت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ یہی ہے۔ لیکن کسی تصوّرِ حیات، نظامِ زندگی یا اس تصوّر و نظام کی حامل قوم کی

اقوام کی زندگی ماپنے کے پیمانے

کیفیات کا مشاہدہ ایک دن میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ خدا کے کائناتی قوانین کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ سورۃ الحج میں ہے۔ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ جس

تباہی اور بربادی سے انہیں ڈرایا جاتا ہے۔ وہ جلدی کیوں نہیں آتی۔ اگر ہماری روش غلط ہے تو ہم عذاب میں کیوں نہیں ماخوذ ہو جاتے؟ اس کے جواب میں کہا گیا کہ وَ لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ۔ تم اس کا یقین رکھو کہ خدا کا قانونِ مکافات اٹل ہے۔ اس میں کبھی خطا نہیں ہو سکتی۔ لیکن بات یہ ہے کہ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ ...... مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (۲۲/۴۷) خدا کے قانونِ مکافات کا ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہے۔ قومیں نہ ایک دن میں بنا کرتی ہیں، نہ ایک دن میں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کی زندگی اور موت کے پیمانے افراد کے پیمانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا، اگر کسی قوم کے غلط نظامِ معاشرت کا تباہ کن نتیجہ جلد سامنے نہیں آتا تو اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ ان کی اس غلط روش کا نتیجہ مرتب ہی نہیں ہو رہا۔ میزانِ کائنات میں ان کے ہر عمل کا ذرّہ ذرّہ تلتا ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ ...... شَرًّا يَّرَهٗ۔ (۹۹/۷-۸) جو ایک ذرّہ کے برابر بھی ٹھیک کام کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ بھی سامنے آ جائے گا۔ جو ایک ذرّہ کے برابر غلط کام کرتا ہے، وہ اسے بھی دیکھ لے گا۔ یہاں کوئی عمل بہ نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن

میزانِ عمل ہر وقت موجود رہتی ہے

افراد کی طرح اقوام کی صحت اور بیماری (اور زندگی اور موت) کا اصول یہ ہے کہ جب تک اچھے کاموں کا پلڑا جھکا رہتا ہے قوم زندہ رہتی اور آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب غلط کاموں کا پلڑا جھک جاتا ہے تو قوم کا تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ (فَاَمَّا مَنْ ...... هَاوِيَةٌ۔ (۱۰۱/۶-۹)) اس لئے کہ تعمیری امور تخریبی امور کے نقصان رساں اثرات کو ساتھ کے ساتھ زائل کرتے رہتے ہیں۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ (۱۱/۱۱۴) اس کے برعکس اگر تخریبی امور کا پلڑا جھکتا چلا جائے تو وہ قوم آہستہ آہستہ، بتدریج، ہلاکت کے جہنم کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے ایسے غیر محسوس انداز سے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہم تباہی کی جانب کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (۷/۱۸۲) ہم انہیں بتدریج اس طریق سے پکڑتے ہیں جس کا انہیں علم بھی نہیں ہوتا۔ اگر وہ قوم اپنی ہلاکت سے پہلے اپنی روش کی اصلاح کر لے اور اس کی جگہ صحیح طریقِ زندگی اختیار کر لے تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہے لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتی اور تباہی کے جہنم تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کے لئے بازآفرینی کا کوئی موقع نہیں رہتا۔ وَ حَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ ...... يَرْجِعُوْنَ (۲۱/۹۵) اور وہ اس طرح ہلاک ہوتی ہے کہ فَمَا بَكَتْ ...... مُنْظَرِيْنَ۔ (۴۴/۲۹) کہ ان کی تباہی پر نہ آسمان روتا ہے، نہ زمین۔ اور نہ ہی انہیں مہلت دی جاتی ہے۔

جس طرح افراد کی طبعی زندگی سے متعلق بیماریاں مختلف ہوتی ہیں اسی طرح اقوام کے نظام ہائے تمدن و معیشت کی خرابیاں بھی متنوع ہوتی ہیں۔ پھر جس طرح ہر مرض اور اس کی وجہ سے آنے والی موت کا درمیانی عرصہ مختلف ہوتا ہے ــ تپ دق سے مریض برسوں میں گھل گھل کر مرتا ہے لیکن گردن توڑ بخار چند دنوں کی بھی مہلت نہیں دیتا۔ اسی طرح نظام

اجل کا مفہوم

ہائے تمدن و معیشت کی خرابی اور اس کی وجہ سے آنے والی ہلاکت میں بھی مہلت کا وقفہ مختلف ہوتا ہے۔ اس مہلت کے وقفہ کی آخری حد کو قرآن کی اصطلاح میں اجل کہتے ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے کہ لِكُلِّ اُمَّةٍ ...... لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (۱۰/۴۹، ۷/۳۴) ہر قوم کے لئے ایک اجل ہوتی ہے۔ اس وقت سے پہلے پہلے تو ان کے لئے اصلاحِ احوال کی گنجائش ہوتی ہے لیکن جب وہ آخری وقت آ جاتا ہے تو اس میں ایک گھڑی کا تقدم و تاخر بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ (طبیعی امراض کی طرح) اجتماعی زندگی اور موت کے لئے بھی اٹل قانون مقرر ہے، اور یہ سب کچھ اس قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں یہ کہا گیا ہے کہ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ــ ہر قوم یا ہر نظام کے لئے ایک

اجل ہوتی ہے" تو دوسری جگہ یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ لِكُلِّ أَجَلٍ كِتَابٌ (۱۳/۳۸) "ہر اجل کے لئے ایک قانون مقرر ہے"۔ قوموں کا محو و ثبات اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ يَمْحُو اللّٰهُ .... وَيُثْبِتُ، اور یہ سب کچھ خدا کی اس مشیت کے مطابق ہوتا ہے جس کی رو سے افراد اور اقوام کی موت اور زندگی کے لئے قوانین مرتب ہوتے ہیں۔ وَعِنْدَهُ أُمُّ الْكِتَابِ (۱۳/۳۹) "قانون کی اصل و بنیاد اس کے پاس ہے"۔

موت وحیات علیٰ بصیرت

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کی رو سے قوموں کی موت و حیات نہ یونہی ہنگامی اور اتفاقی طور پر واقع ہوتی ہے اور نہ ہی "فطرت کی کسی اندھی قوت" کی رو سے، محض دھاندلی سے۔ یہ سب کچھ قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ ... (۸/۴۲) "تاکہ جو ہلاک ہو وہ بھی دلیل اور برہان کی رو سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہے وہ بھی دلیل اور برہان کی رو سے زندہ رہے"۔ یہاں نہ زندگی بخشش کے طور پر ملتی ہے، نہ ہلاکت اندھا دھند دھاندلی سے ہوتی ہے۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ ... يَظْلِمُونَ (۹/۷۰) "خدا کسی قوم پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ قوم خود اپنے آپ پر ظلم کرتی ہے" اور اسی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہے۔ خدا کو (معاذ اللّٰہ) کسی پر ظلم کر کے لذت نہیں ملتی کہ وہ دوسروں کو عذاب میں مبتلا کر کے ان کے تڑپنے اور پھڑکنے کا تماشہ دیکھے۔ وہ کہتا ہے کہ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ شَكَرْتُمْ وَآمَنْتُمْ (۴/۱۴۷) "اگر تم خدا کے مقرر کردہ اصولوں پر قائم رہو اور زندگی کے امکانات کی قدر کرو، تو اللّٰہ نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے؟" جو

خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا

قوم یہ سمجھتی ہے کہ رَبِّي أَهَانَنِ (۸۹/۱۶) "خدا نے ہمیں یونہی بے جرم و خطا ذلیل کر دیا" وہ ان سے للکار کر کہتا ہے کہ كَلَّا — ہرگز نہیں۔ تم غلط کہتے ہو۔ خدا نے بلاوجہ تمہیں ذلیل نہیں کر دیا۔ بَلْ لَا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ (۸۹/۱۷) "تمہاری حالت یہ تھی کہ تم کسی ایسے انسان کی عزت نہیں کرتے تھے جو معاشرے میں تنہا رہ جائے"۔ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ (۸۹/۱۸) "نہ تم ایک دوسرے کو ترغیب دیتے تھے کہ جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے، اس کی روٹی کا انتظام کرنا چاہیئے۔ اس کے برعکس تمہاری حالت یہ تھی کہ وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَمًّا (۸۹/۱۹) تم باپ دادا سے ملی ہوئی دولت کو سمیٹ کر خود ہی کھا جاتے تھے۔ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹/۲۰) اور دولت سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ چاہتے تھے کہ دوسروں کا مال و متاع بھی تمہارے قبضے میں آ جائے۔ تم نے ایسا نظام قائم کر رکھا تھا جس کا لازمی نتیجہ تمہاری ذلت و خواری تھی۔ یہ وجہ تھی کہ تم ذلیل ہو گئے۔ خدا نے تمہیں یونہی، بلاوجہ، ذلیل نہیں کر دیا۔ خدا ایسا قطعاً نہیں کیا کرتا۔ جب تک کوئی قوم صلاحیت بخش نظام پر کاربند رہتی ہے، ہلاکت سے محفوظ رہتی ہے۔ وَمَا كَانَ رَبُّكَ ..... مُصْلِحُونَ (۱۱/۱۱۷) ہلاکت انہی کی ہوتی ہے جو صحیح قالب چھوڑ کر اپنے لئے غلط پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ (۴۶/۳۵)

ہلاکتِ اُمم سے کیا مراد ہے؟

سوال یہ ہے کہ قوموں کی ہلاکت سے مراد کیا ہے؟ اس سے یہ مراد نہیں کہ اس قوم کا ایک ایک فرد موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور اس طرح اس کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کے ابتدائی ادوار میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ پوری کی پوری قوم طبعی طور پر تباہ ہو جاتی تھی، اور اس طرح ان کا نام و نشان مٹ جاتا تھا لیکن

قرآن کہتا ہے کہ قوموں کی ہلاکت سے دراصل مراد یہ ہے کہ اس قوم سے قوت و سطوت اور غلبہ و حکومت چھن جاتے ہیں اور اس کی جگہ کوئی اور قوم لے لیتی ہے۔ اسے قانونِ استبدال و استخلافِ اقوام (LAW OF SUCCESSION AND SUBSTITUTION OF NATIONS) کہا جاتا ہے۔ مثلاً سورۃ محمد میں ہے۔ ھٰاَنْتُمْ ..... اَلْفُقَرَآءُ۔ (47/38) دیکھو تمہاری حالت یہ ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ تم (اپنی فاضلہ دولت کو) نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے دیدو تو تم میں وہ لوگ ہیں جو ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ساری کی ساری دولت سمیٹ کر اپنے مفاد کی خاطر جمع رکھی جائے۔ سو تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جو شخص دولت کو اسطرح سمیٹ کر دوسروں کو انکی نشوونما سے محروم رکھنا چاہتا ہے وہ دراصل اپنی ذات کو نشوونما سے محروم رکھتا ہے خدا نے جب تم سے کہا تھا کہ اس دولت کو دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدو۔ تو یہ تمہارے ہی بھلے کی بات تھی اسے تمہاری دولت کی ضرورت نہیں وہ تمہارا محتاج نہیں۔ تم اس کے محتاج ہو۔ بہرحال تم اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔ اِنْ تَتَوَلَّوْا ..... اَمْثَالَکُمْ (47/38) اگر تم صحیح نظامِ زندگی سے پھر گئے (جس میں معاشرہ کا فریضہ تمام نوعِ انسانی کی نشوونما ہوتا ہے) تو خدا تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا۔ اور وہ تمہارے جیسے نہیں ہوں گے۔

یہاں قرآن نے اتنا ہی کہا ہے کہ وہ قوم جو تمہاری جگہ لے گی تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ دوسرے مقام پر کہا ہے کہ وہ تم سے بہتر ہوگی۔ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ..... مِنْھُمْ (70/40-41) اس سے ظاہر ہے کہ جو قوم کسی دوسری قوم کی جگہ لیتی ہے وہ جانے والی قوم سے بہرحال بہتر ہوتی ہے۔

مادی قوتوں کا ٹکراؤ

قوموں کا باہمی تصادم، ایک تو مادی سطح پر ہوتا ہے۔ اس میں جس قوم کے پاس مادی قوت زیادہ ہو اسے غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یعنی ان میں سے کسی کے پاس بھی صحیح نظام نہیں ہوتا۔ "جنگل کا قانون" ان کا ضابطہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا ٹکراؤ حیوانی سطح پر ہوتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وَکَذٰلِکَ ..... یَکْسِبُوْنَ (6/129) "اس طرح ہم ظالموں کے ایک گروہ کو ظالموں کے دوسرے گروہ پر حاکم بنا دیتے ہیں"۔ یا ایک ہی قوم میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ قُلْ ھُوَ الْقَادِرُ ..... بَأْسَ بَعْضٍ (6/65) یعنی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قوم پر مستبد حکام عذاب بن کر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اور عوام ان کے نیچے پستے چلے جاتے ہیں۔ اس کا ردِّ عمل یہ ہوتا ہے کہ نیچے سے عوام اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور حکام کے خلاف بغاوت برپا کر دیتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لیڈر اور عوام مل کر الگ الگ پارٹیاں بنا لیتے ہیں اور یہ پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو جاتی ہیں۔ ان تمام تصادمات کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ لیکن قرآن جس مقام کو ابھار کر سامنے لاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک قوم کے پاس قوت اور دولت کی بھی کمی نہیں۔ تعداد بھی ان کی بہت ہے۔ انہیں غلبہ اور اقتدار بھی حاصل ہے لیکن چونکہ ان کا نظام غلط بنیادوں پر استوار

غلط اور صحیح نظام کا ٹکراؤ

ہے اس لئے وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۃ روم میں ہے۔ اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا ..... یَظْلِمُوْنَ (30/9) کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں جو یہ دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہو گزری ہیں ان کا انجام کیا ہوا۔ وہ لوگ ان سے قوت میں بڑھ چڑھ کر تھے۔ انہوں نے زمین کو زراعت کے قابل بنایا اور اسے ایسا آباد کیا کہ ان لوگوں (قومِ مخاطب) نے بھی ویسا آباد نہیں کیا۔ لیکن

ان کا نظام غلط تھا اس لئے ہمارے پیغمبران کے پاس آئے لیکن انہوں نے ان کی باتوں پر توجہ نہ دی اور تباہ ہو گئے) سو اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا تھا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔ دوسرے مقام پر قرآن کہتا ہے کہ یہ نہیں کہ یہ لوگ وحشی اور ظالم تھے۔ یہ عقل و بصیرت رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود نہیں سمجھتے تھے کہ ان کا نظام معاشرہ کس قدر کمزور بنیادوں پر استوار ہے۔ چنانچہ وہ عاد و ثمود۔ (اقوام گذشتہ) کے متعلق کہتا ہے کہ وَ قَدْ تَّبَیَّنَ ۔۔۔ کَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ ۔ (۲۹/۳۸) ان کی تباہی ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے ہویدا ہے۔ ان کی ذاتی مفاد پرستیاں ان کے غلط نظام کو ان کی نگاہوں میں نہایت درخشندہ اور تابندہ بنا کر دکھاتی تھیں۔ اور اس طرح انہیں صحیح راستے پر چلنے سے روکتی تھیں۔ حالانکہ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ وَ لَقَدْ مَکَّنّٰھُمْ ۔۔۔ فِیْہِ (۴۶/۲۶) ہم نے ان اقوام کو ایسا تمکن عطا کیا تھا جو تمہیں بھی نہیں دیا۔ وَ جَعَلْنَا لَھُمْ ۔۔۔ اَفْئِدَۃً اور ہم نے انہیں سمع و بصر اور قلب بھی عطا کیا تھا۔ ان کے ذرائع علم بہت وسیع تھے اور دانش و بینش سے بھی بہرہ وافر عطا ہوا تھا۔ فَمَآ اَغْنٰی عَنْھُمْ ۔۔۔ یَسْتَھْزِءُوْنَ (۴۶/۲۶) لیکن چونکہ وہ قوانین خداوندی سے انکار کرتے تھے اور معاشرہ کو اپنے خود ساختہ اصولوں کے مطابق چلاتے تھے اس لئے ان کے سمع و بصر اور قلب ان کے کسی کام نہ آئے اور انہیں اس تباہی نے آلیا جس پر وہ ہنسا کرتے تھے۔ یہ ہے وہ

علم و بصیرت کے باوجود تباہی

مقام جسے قرآن ابھار کر سامنے لاتا ہے۔ یعنی ایک قوم کے پاس دولت کی فراوانیاں ہیں۔ سامان زیست کی کمی نہیں۔ قوت و سطوت۔ شوکت و حشمت۔ جاہ و جلال سب کچھ ہے۔ اس کے ساتھ دنیاوی علوم کی بھی کمی نہیں۔ لیکن ذاتی مفاد پرستی کے جذبات اس قدر شدید ہیں کہ وہ ان کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کئے ہیں اور انہیں نظر ہی نہیں آتا کہ جس راستے پر وہ چل رہے ہیں اس کا انجام کیا ہے۔ ان کے سامنے صحیح نظام خداوندی پیش بھی کیا جاتا ہے لیکن (چونکہ وہ ان کے عاجلانہ مفاد کے خلاف جاتا ہے اس لئے) وہ اس کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جس لئے کہ ان کا نظام غلط بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔

سلطنت روما کا زوال

تاریخ تہذیب کا مشہور مؤرخ برفا (BRIFFAULT) سلطنت روما کی تباہی کے اسباب و علل پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے۔

> انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس نظام باطل کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم و ضبط اور ادھر ادھر کی جزوی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص جماعت کو متموّل بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے "سوداگری" کو نہایت قابلیت اور تدبر، خلوص اور دیانتداری سے چلایا۔ لیکن حسن انتظام کی یہ تمام خوبیاں بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رو رعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔ (ص ۱۵۱)

آگے چل کر یہی مؤرخ لکھتا ہے۔

> اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی

ہی بلند ہو گئی ہے نہ ہی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کو تولنے کے قابل ہو جائے اور علوم و فنون کے وسیع میدانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے تب بھی اس کے جوہر ذاتی میں قلب ماہیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں۔ . . . قوت تہذیب کلچر بے معنی چیزیں ہیں اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت ماپی جا سکتی ہے، اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔ (ص ۲۵۹)

اس قسم کے غلط نظام کے مآل و انجام کے متعلق وہ کہتا ہے۔

وہ نظام تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو۔ آخر لامرتباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی فرد کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے فیض اندوز ہوتی ہے اس ناانصافی کی وجہ سے انجام کار بربادی سے دوچار ہوتی ہے۔ انتخاب طبیعی کے اٹل قانون کی بنا پر گناہ کی اجرت موت ہے (ص ۲۶۲)

یہ تو ایک قدیم تمدن کی تباہی کے اسباب و علل کا تجزیہ تھا۔ تہذیب مغرب، جس کی چمک دمک اچھے اچھے دیدہ وروں کی نگاہ میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے، اس کے انجام و مآل کے متعلق خود مغرب کے مفکرین جس بری طرح واویلا مچا رہے ہیں اس

تہذیب مغرب کا مآل

پر ان کے آئے دن شائع ہونے والی تصانیف و مقالات شاہد ہیں (RENE GUENON) اپنی تصنیف (THE CRISIS OF MODERN WORLD) میں لکھتا ہے۔

عہد حاضر کی تہذیب رفتہ رفتہ تنزل کی طرف گرتی گئی ہے۔ حتیٰ کہ یہ انسان کے پست ترین عناصر کی سطح پر جا کر غرق ہو گئی ہے۔ اس کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانی فطرت کے محض مادی گوشے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ نصب العین خود ایک فریب ہے۔ اس لئے کہ یہ جس قدر انسانی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے اس سے زیادہ مصنوعی ضروریات کو پیدا کر دیتا ہے۔ . . . اس عہد کے انسان نے نہ صرف اپنی ذہنی کاوشوں کو مشینوں کی ایجاد اور ساخت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ بلکہ وہ خود رفتہ رفتہ مشین بن چکا ہے۔

یہ ایجادات جن کا شمار دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ اس لئے کہ وہ ان قوتوں کو بروئے کار لا رہی ہیں جن کی اصل حقیقت کا علم ان انسانوں کو نہیں جو انہیں استعمال کرتے ہیں۔ . . . . جو لوگ مادہ کی وحشی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ خود اپنی قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ . . . . دور حاضر میں مادی قوانین کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مادہ اس انسان کو برباد کر دے گا جو خود مادہ سے بلند ہوئے بغیر اس کی تسخیر چاہتا ہے۔ اس لئے بعید نہیں کہ موجودہ دنیا خود ان ایجادات ہی کے ہاتھوں تباہ ہو جائے۔

پروفیسر آئن سٹائن، اپنی کتاب (OUT OF MY LATER DAYS) میں لکھتا ہے۔

ہم نے تلخ تجربہ کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رُو سے نہیں سلجھ سکتیں۔ سائنس کی تحقیقات اکثر اوقات نوع انسان کے لئے بڑی مہلک ثابت ہوئی ہیں۔ ان سے انسان کو طبیعی زندگی

میں آرام اور عشرت تو ضرور مل گئے لیکن اس کی داخلی دنیا میں عجیب قسم کا کرب و اضطراب پیدا ہو گیا جس سے وہ اپنے ٹیکنیکل ماحول کا غلام بن کر رہ گیا۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اسے خود اپنی تباہی کے لئے بڑے بڑے سامان مل گئے..... اس لئے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خدا نہیں بنا لینا چاہیئے۔ اس خدا کے عضلات تو بہت مضبوط ہیں لیکن اس کی ذات نہیں ہے۔ عقل، ذرائع و اسباب پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے لیکن مقاصد و اقدار کی طرف سے بالکل اندھی ہوتی ہے۔

یہ تو ہے اس تہذیب کے ہاتھوں معاشرہ کی حالت۔ فرد کی حالت اس سے بھی زبوں تر ہے۔ ڈاکٹر ینگ، اپنی عمر بھر کے تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

عصر حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں یعنی ان حوادث کے مقابلہ میں ہراساں جن پر وہ اپنے دور کی سیاسی و معاشی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی حالت۔ اور اگر وہ اس خارجی دنیا سے ہٹ کر اپنی داخلی دنیا کی طرف جھانکتا ہے، تو وہاں اسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

(MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL)

یہی وہ انسان ہے جس کے متعلق حکیم الامت (اقبال) نے بہت پہلے کہا تھا کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

"زندگی کی شب تاریک" میں نور سحر، ان مستقل اقدار کے خورشید جہاں تاب سے آئینہ پاش ہوتا ہے جو وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور جو آج قرآن کی دو تین میں محفوظ ہیں۔ جب تک دنیا کا نظام ان اقدار کی بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا، تاریکیاں چھٹ نہیں سکتیں۔

اس مقام پر یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کے نہ ہونے سے قومیں اس قدر دولت و حشمت، قوت و شوکت، عقل و دانش اور علم و بصیرت کے باوجود تباہیوں کے جہنم میں جا گرتی ہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ لیکن قرآن نے اس کا جو جواب دیا ہے جوں جوں نگاہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے انسان وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو!

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۸/۵۳)

یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ نے جو نعمت کسی قوم کو دے رکھی ہو، وہ اس سے، کبھی نہیں چھینتا تاوقتیکہ وہ قوم اپنے اندر اپنی نفسیاتی دنیا میں تبدیلی نہ کر لے۔ یاد رکھو! اللہ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

داخلی تبدیلی

قرآن نے اس چھوٹی سی آیت میں قوموں کے عروج و زوال کا وہ فلسفہ بیان کر دیا ہے جو بڑی بڑی ضخیم مجلدات میں بھی نہیں سما سکتا۔ وہ کہتا ہے کہ خارجی دنیا دراصل انسان کی داخلی دنیا کا عکس ہوتی ہے جب تک اس کی داخلی دنیا میں تبدیلی نہ ہو اس کی خارجی دنیا میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ پھر جس قسم کی تبدیلی اس کی داخلی دنیا میں ہو گی اسی قسم کی تبدیلی اس کی خارجی دنیا میں ہو جائے گی۔ اسکی داخلی دنیا میں تبدیلی اس چیز سے ہوتی ہے۔

جسے قرآن اپنی اصطلاح میں "ایمان" سے تعبیر کرتا ہے یعنی صحیح زاویۂ نگاہ ۔ راست نصب العین حیات ۔ وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار پر یقینِ محکم ۔ اس سے انسان کی داخلی قوتیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور اس سے ایسے محیرالعقول نتائج مرتب ہوتے ہیں جن کا تصور بھی ویسے نہیں کیا جا سکتا ۔ یہی وہ "شے" ہے جس کے فقدان کا رونا روتے ہوئے برٹرینڈرسل لکھتا ہے کہ

ایمان کا فقدان

ہماری موجودہ مشکل یہ ہے کہ ہم نے خارجی قوتوں کو تو بے حساب اندازے مسخر کر لیا ہے لیکن ان قوتوں کو قطعاً مسخر نہیں کیا جو خود ہمارے اندر ہیں ضبطِ نفس ہمیشہ معلمین اخلاق کا سب سے پہلا سبق رہا ہے ۔ لیکن زمانہ سابقہ میں اس کا کوئی واضح مفہوم سامنے نہیں ہوتا تھا (اس کا مفہوم یہی ہے کہ خارجی قوتوں کو کس طرح صحیح اقدار کے تابع صرف کیا جائے)

(AUTHORITY AND THE INDIVIDUAL)

ڈاکٹر ینگ (جس کا ذکر ابھی ابھی کیا جا چکا ہے) اس باب میں لکھتا ہے ۔

میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیۂ نفس کیا ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے زندگی کے مسائل کے حل کے لئے مذہبی زاویۂ نگاہ کی تلاش نہ ہو ۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اُس "شے" کو ضائع کر دیا تھا جو زندہ مذہب انسان کو مہیا کرتا ہے ۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی "شے" دیدی جاتی جو ان سے گم ہو چکی تھی یہی ان کی دوا تھی ـــــ عقیدہ، اُمید، محبت، نگہ خوردبین (صفحہ ۲۹۴)

عصرِ حاضر کے ان محققین و مورخین کی یہ تمام تحقیقات تشریح و توضیح ہیں قرآن کی اس آیت کی جسے ہم نے اوپر درج کیا ہے یعنی اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ ..... بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) قرآن قوموں کے عروج و زوال کا راز، ان کے تغیرِ نفس میں بتاتا ہے اور تغیرِ نفس پیدا ہوتا ہے ۔ وحی کی اقدار پر یقینِ محکم سے ۔

اوپر کا طبقہ پہلے بگڑتا ہے

قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ قوموں میں خرابیوں کی ابتدا ان کے اوپر کے طبقے سے شروع ہوتی ہے اور وہاں سے پھیل کر یہ نیچے کے طبقے کو متاثر کرتی ہیں ۔ وَ كَذٰلِكَ ..... لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا (۶/۱۲۴) یہ بڑے بڑے مجرمین اس امر کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں کہ ان کے قائم کردہ غلط نظام کے بندھن ڈھیلے نہ ہونے پائیں ۔ یہ "اکابر مجرمین" وہ ہیں جو دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں ۔ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ..... مُجْرِمِيْنَ (۱۱/۱۱۶) یہ لوگ اپنی مفاد پرستیوں اور عیش سامانیوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں ۔ اور اس طرح ظلم و استبداد اور غضب و نہب کا چلن عام ہو جاتا ہے ۔ یہی لوگ ہیں جو کاروانِ ملت کے قافلہ سالار بنتے ہیں لیکن قافلہ کو تباہیوں کے گھر میں جا کر اتار دیتے ہیں ۔ سورۂ ابراہیم میں ہے ۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى ..... بِئْسَ الْقَرَارُ (۱۴/۲۸-۲۹) "کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جو خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناسپاس گذاری کرتے ہیں اور قوم کے قافلہ کو اس منڈی میں لے جاتے ہیں جہاں اس جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہیں ہوتا یعنی اسے تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں جا اتارتے ہیں ـــــ اور وہ کیسی بُری منزل ہے ۔

لیکن قرآن لیڈروں کو موردِ الزام قرار دے کر، عوام کو بری الذمہ نہیں ٹھہرا دیتا ۔ وہ انہیں بھی برابر کا مجرم قرار

دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس کا منشاء یہ نہیں کہ عوام بھیڑوں کی طرح سر نیچا کئے، چرواہے کی آواز پر چلتے جائیں۔ وہ عوام کی ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ کھرے کھوٹے کی پہچان کریں اور صرف اسی راستے پر چلیں جو ان کے نزدیک عافیت اور سلامتی کا راستہ ہو۔ قرآن نے اس حقیقت کو بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ لیڈر اور ان کے متبعین (FOLLOWERS) دونوں جہنم میں جمع ہوں گے اور ایک دوسرے کو طعن و تشنیع کریں گے۔ عوام لیڈروں سے کہیں گے کہ تم نے ہمیں تباہ کیا۔ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور صحیح راستے پر چلتے۔ (۳۴/۳۱)

جہنم میں عوام اور لیڈروں کا مکالمہ

لیڈر اس کے جواب میں کہیں گے کہ قصور سارا تمہارا اپنا ہے اور ناحق الزام ہم پر دھرتے ہو۔ صحیح راستہ تمہارے سامنے تھا۔ اگر تم اس پر چلنا چاہتے تو تمہیں کون روک سکتا تھا؟ ہم نے تمہیں کبھی نہیں کہا کہ تم صحیح روش زندگی چھوڑ کر ہمارے پیچھے لگو۔ مجرم تم خود ہو اور الزام ہمارے سر دھرتے ہو۔ (۱۴/۲۲) اس کے جواب میں عوام کہیں گے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم زبان سے تو ہمیں نہیں کہتے تھے کہ ہم جرائم کے مرتکب ہوں۔ لیکن تم دن رات اس قسم کی سازشوں اور تدبیروں میں لگے رہتے تھے جن سے بچ نکلنا سادہ لوح عوام کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس طرح تم بالواسطہ ہمیں مجبور کر دیتے تھے کہ ہم قوانین خداوندی کو چھوڑ کر تمہاری تجویز کردہ راہوں پر چل نکلیں (۳۴/۳۳) دوسری جگہ ہے کہ یہ متبعین خدا سے خواہش کریں گے کہ ہمارے یہ بڑے بڑے لیڈر جنہوں نے اپنے ساتھ ہمیں بھی تباہ کیا ہے، انہیں دوچند عذاب دیجئے۔ ایک حصہ ان کے اپنے جرائم کا اور ایک حصہ ان جرائم کا جو انہوں نے ہم سے کرائے۔ (۳۳/۶۷)

اس، اور اسی قسم کے دیگر کئی ایک مقامات میں لیڈروں اور عوام کے اس قسم کے مکالمات کے تمثیلی بیان سے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ قوموں کی تباہی میں عوام اور اکابر دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اکابر اس لئے کہ وہ اپنی مفاد پرستیوں کی خاطر عوام کو اپنا آلہ کار بناتے ہیں۔ اور عوام اس لئے کہ وہ ان غلط کار اکابرین کی ہوس پرستیوں کے آلہ کار بننے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیڈروں کی قوت درحقیقت عوام ہی سے ہوتی ہے۔

پھر جس طرح ایک قوم کے مختلف طبقات ایک دوسرے سے متاثر ہو کر تباہی اور بربادی کی زنجیروں کی مختلف کڑیاں بنتے ہیں، اس طرح ایک قوم دوسری قوموں کی نقالی سے تباہی کے جہنم میں جا گرتی ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا (۷/۳۸) جب کبھی ایک قوم جہنم میں داخل ہو گی تو وہ اپنی بہن دوسری قوم پر لعنت کرے گی (کہ ہمیں اس نے تباہ کیا) حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا ..... مِنَ النَّارِ (۷/۳۸) یہاں تک کہ جب تمام اقوام تباہی کے جہنم میں اکٹھی ہو جائیں گی تو بعد میں آنے والی قومیں اپنی پیش رو قوموں کے متعلق کہیں گی کہ اے ہمارے پروردگار! انہوں نے گمراہ کیا تھا سو انہیں دوگنا عذاب دے۔ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَلَٰكِن لَّا تَعْلَمُونَ (۷/۳۸) اس کے جواب میں ان سے کہا جائے گا کہ تم میں سے ہر ایک کے لئے دوگنا عذاب ہے۔ اس لئے کہ اگر پیش رو قومیں اس لئے دوگنے عذاب کی مستحق ہیں کہ انہوں نے دوسروں کو گمراہ کیا تو ان کے پیچھے لگنے والی قومیں اس لئے دوہرے عذاب کی سزاوار ہیں کہ وہ آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے کیوں لگیں؟ واضح رہے کہ قرآن کے نزدیک اپنی عقل و فکر سے کام نہ لینا اور دوسروں کی اندھی تقلید کئے جانا ایسی روش ہے جو افراد اور اقوام دونوں کو سیدھا جہنم کے گڑھے میں جا گراتی ہے اس لئے قرآن کی رُو سے ہر قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی عقل و فکر سے

تابع اور متبوع قومیں

کام لے، اور جو راہ قوانین خداوندی نے متعین کی ہے اس پر چلے۔ اس سے وہ شادابیوں اور سرفرازیوں کی جنت کے راستے پر چل نکلے گی۔ لیکن اگر اس نے اپنی دانش و بینش سے کام لینا چھوڑ دیا تو اس کا یہی جرم اس کی تباہی کے لئے کافی ہوگا۔ قرآن تو اچھی روش پر بھی بلا سوچے سمجھے چلنے کی اجازت نہیں دیتا۔ (۱۷/۳۶) چہ جائیکہ کسی دوسری قوم کی تقلید محض اس لئے کی جائے کہ اسے دنیا میں زیادہ قوت و اقتدار حاصل ہے۔ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) عارضی غلبہ و اقتدار اور دولت و ثروت (کچھ عرصہ کے لئے) غلط نظام سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا انجام بہرحال تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ وَكَمْ أَهْلَكْنَا ..... نَحْنُ الْوَارِثِينَ (۲۸/۵۸) کتنی بستیاں ایسی تھیں جنہیں ہم نے سامانِ زیست کی فراوانیوں کے باوجود تباہ و برباد کر دیا (اس لئے کہ ان کا نظام معاشرہ غلط بنیادوں پر استوار تھا) یہ دیکھو! ان کے مکانات ہیں جو ان کے بعد بہت کم آباد ہوئے اور ان کے وارث ہم ہی ہوئے"۔ فَهِيَ خَاوِيَةٌ ..... وَقَصْرٍ مَشِيدٍ (۲۲/۴۵)۔ "ان کے رفیع الشان محلات کھنڈرات بن گئے۔ ان کے کنوئیں ویران ہو گئے۔ ان کا نام و نشان مٹ گیا"۔ وَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ (۳۴/۱۹) "اور ان کی فقط داستانیں باقی رہ گئیں"۔ قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ ..... الْمُجْرِمِينَ (۲۷/۶۹)۔ ان سے کہو کہ تم مختلف ممالک کی سیر کرو۔ اور ان کھنڈرات کی ٹھیکریوں سے پوچھو کہ غلط رو قوموں کا انجام کیا ہوتا ہے؟

اس طرح قرآن اقوام گذشتہ کے احوال و کوائف سامنے لا کر (تاریخی شواہد کے مطالعہ سے) اس حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے کہ غلط نظام زندگی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ ان تاریخی نوشتوں سے وہی قومیں سامان عبرت حاصل کر سکتی ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتی ہیں۔ سورۃ الحج میں ہے۔ أَفَلَمْ يَسِيرُوا ..... يَسْمَعُونَ بِهَا (۲۲/۴۶) کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں تاکہ ان کے لئے دل ہوتے جن سے وہ سمجھتے۔ یا کان ہوتے جن سے وہ سنتے۔ فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى ..... فِي الصُّدُورِ (۲۲/۴۶) اس لئے کہ انسان کی (ماتھے کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں، جو سینے کے اندر ہیں۔

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ قرآن کریم کی رو سے، کسی قوم کے عروج و زوال، اور اس کی موت و حیات کا فیصلہ اس نظام کے مطابق ہوتا ہے جسے وہ قوم اپنے لئے اختیار کرتی ہے۔ ایسے نظام کی اساس و بنیاد، اس کے اجزائے ترکیبی، اور ما بہ الامتیاز خصوصیات کیا ہیں، جو قوموں کے عروج و بقا کا ضامن بنتا ہے، اس کے متعلق طلوع اسلام میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس ضمن میں قرآن کریم نے جو بنیادی اصول دیا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ سامنے لایا جائے اور وہ اصول یہ ہے کہ

وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷)

وہی نظریہ حیات، وہی اصول زندگی، وہی نظام معاشرہ، دنیا میں باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوع انسان کے لئے نفع رساں ہو یعنی ایک تو وہ نفع رساں اور منفعت بخش ہو، اور دوسرے یہ کہ اس کی منفعت بخشی کسی خاص گروہ یا خاص پارٹی یا خاص ملک و خاص قوم تک محدود نہ ہو، بلکہ وہ ساری انسانیت کے لئے نفع رساں ہو۔

یہ ہے وہ عالمگیر اصول جس کی بنیادوں پر قرآن اپنا نظام زندگی استوار کرتا ہے اور یہی اصول قوموں کی زندگی کا حقیقی ضامن بن سکتا ہے۔

یہ ہیں وہ اصول و قوانین جن کی رو سے قوموں کی موت اور زندگی کے فیصلے ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہے کہ مفکرین مغرب،

دھی کے قائل نہ ہونے کے باوجود، انہی نتائج پر پہنچے ہیں جنہیں قرآن نے چودہ سو سال پہلے بیان کیا تھا۔ ہم (اہل پاکستان) قرآن پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں لیکن ہماری نگاہ کبھی ان حقائق کی طرف نہیں اٹھتی۔ تشکیل پاکستان کے بعد ہم نے ان قوانین کی طرف سے اعراض برتا، تو رفتہ رفتہ تباہی کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ اب (ایسا نظر آتا ہے کہ) ہم اس کے آخری مرحلہ تک پہنچ رہے ہیں۔ لیکن اب بھی ہماری نگاہ ان حقائق کی طرف نہیں اٹھتی۔ ان حقائق کا ماحصل یہ ہے کہ قوم وہی زندہ رہ سکتی ہے جو اپنا نظام صحیح خطوط پر تشکیل کرے، اور نظام وہی صحیح نتائج مرتب کر سکتا ہے جن کے چلانے والے افراد کی سیرت و کردار، اخلاقیات کے پیمانوں پر ٹھیک اترے۔ ہم نے اس چھبیس سال کے عرصہ میں نہ تو اسے دیکھا ہے۔ کہ یہاں نظام کس قسم کا رائج ہونا چاہیئے اور نہ ہی اس حقیقت کو کوئی اہمیت دی کہ ہم جن افراد کے ہاتھوں میں اقتدار کی باگ ڈور دے رہے ہیں، ان کا کیریکٹر کس قسم کا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم نے (جہنم کے مکالمات کے سلسلہ میں) عوام سے کہا ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ اس تباہی کے ذمہ دار ہم نہیں، یہ خواص (ارباب اقتدار) ہیں، تو یہ بتاؤ کہ ان خواص کو اقتدار سونپا کس نے تھا؟ تم ہی نے تو سونپا تھا۔ زمانہ گذشتہ میں اگر یہ حقیقت اچھی طرح واضح نہ بھی ہوتی ہو، تو دورِ حاضرہ کے جمہوری نظام میں اس کے سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری نہیں ہو سکتی۔ اس نظام کی رو سے، ارباب اقتدار عوام ہی کے منتخب کردہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اب، عوام یہ کہہ کر کس طرح بری الذمہ ہو سکتے ہیں کہ اس تباہی کے باعث ہم نہیں، ارباب اقتدار ہیں۔ سوچئے کہ انتخابات کے وقت ہم نے کبھی بھی افراد متعلقہ کے کیریکٹر کو معیارِ انتخاب قرار دیا تھا؟ حضور نبی اکرم نے اپنی قوم مخاطب سے کہا تھا کہ میں تمہیں کسی قسم کا دھوکا دے سکتا ہوں، نہ تم دھوکا کھا سکتے ہو، اس لئے کہ قد لبثت فیکم عمراً من قبلہ۔ میں نے ساری عمر تمہارے اندر گذاری ہے۔ جمہوری نظام میں، باہر کے لوگ آکر مسلط نہیں ہو جاتے وہ سب ہم میں سے ہوتے ہیں۔ اور انہوں نے ساری عمر ہمارے اندر بسر کی ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے کیریکٹر کے متعلق ہم کسی تاریکی میں نہیں ہوتے۔ جب صورت یہ ہو تو پھر اپنی تباہی کے اسباب، خارج میں تلاش کرنا، خود فریبی نہیں تو اور کیا ہے؟

باقی رہا صحیح نظام، سو صحیح کردار کے لوگ صحیح نظام سے کبھی اعراض نہیں برتتے اور صحیح نظام ہمارے پاس (خدا کی کتاب میں) موجود ہے۔

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دوکانیں

سٹینڈرڈ آٹو موبائلز پر تشریف لائیے

سپیشلسٹ: ڈاج، بیڈ فورڈ، لی لینڈ، بی۔ ایل۔ ایم سی۔ ڈیلرز: موٹر پارٹس۔ ٹرک (ڈیزل) پارٹس۔

۱۳۵۔ بادامی باغ ٹیلیفون 69012 لاہور

مجلسِ مذاکرہ

جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے، طلوعِ اسلام کنونشن میں ایک نشست مجلسِ مذاکرہ کے لئے مختص ہوتی ہے جس میں (بالعموم) طلباء اور طالبات حصہ لیتے ہیں۔ اور خود اپنے منتخب کردہ موضوع پر آزادانہ اظہارِ خیالات کرتے ہیں۔ سابقہ کنونشن (منعقدہ نومبر ۱۹۷۲ء) میں ہفتہ ۲۵ نومبر کو مجلسِ مذاکرہ کا انعقاد ہوا جس کا موضوع تھا۔

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار — انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

مذاکرہ میں سولہ شرکاء نے حصہ لیا۔ ان کی تقاریر طلوعِ اسلام بابت اپریل، مئی اور جولائی ۱۹۷۳ء میں (قسط وار) شائع ہو چکی ہیں۔ آخری تقریر (عزیزہ مہتی) سلمٰی پرویز (سلمہا) کی تھی جسے اب ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ عزیزہ کا اسلوب عام روش سے ہٹ کر ہے۔ دیگر شرکائے مذاکرہ نے (بالعموم) اس حقیقت کی وضاحت کی سعی کی تھی کہ ہمارے غلط نظامِ تعلیم کی وجہ سے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کس طرح پریشانیٔ فکر و نظر کا شکار ہو رہا ہے لیکن عزیزہ سلمٰی نے کہا ہے کہ یہ سب بجا اور درست لیکن جو کچھ ہمیں اپنے بزرگوں سے ملتا چلا آ رہا ہے ذرا اس پر بھی تو غور کیجئے اور سوچئے کہ ہماری نوزادوں کی فکرِ خام کے مقابلہ میں ہمارے بزرگوں کی فکرِ پختہ کس قسم کے نتائج پیدا کرتی ہے۔ اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو عزیزہ کا یہ مقالہ بڑا فکر انگیز ہے۔

۲- آخر میں ایک مقالہ محترم محمد احمد صاحب کا درج کیا جا رہا ہے جو دیر سے موصول ہونے کی وجہ سے شریکِ مذاکرہ تو نہ ہو سکا لیکن طلوعِ اسلام میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس سے نومبر ۱۹۷۲ء کے مجلسِ مذاکرہ کی روئیداد اختتام پذیر ہوتی ہے۔

(۱۶)

سلمٰی پرویز

میرے واجب الاحترام بزرگو! ... اپنی جانی پہچانی بیٹی کا سلام لو۔

آپ کو یاد ہو گا کہ جب سے طلوعِ اسلام کنونشن میں بزمِ مذاکرہ کی ابتدا ہوئی ہے، اس کا اختتام ہم دو بہنوں کے خطابات پر ہوتا تھا۔ گویا ہم دونوں بہنیں اس نظمِ مرصّع کے قطعے کے دو مصرعے تھے۔ اس دفعہ سوءِ اتفاق سے میری بڑی بہن نجمہ کی طبیعت ناساز ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی ہزار آرزوؤں کے باوجود شریکِ مذاکرہ نہیں ہو سکی۔ اس کا مجھے افسوس ہے لیکن اس میں ایک تسکین کا پہلو بھی مضمر ہے۔ ہم نے جب بزمِ مذاکرہ میں شرکت شروع کی تو ہماری عمر آٹھ آٹھ دس دس برس کی ہو گی۔ اس لئے ہمارے حصے میں وقت بھی بڑوں کے مقابلہ میں آدھا ہی آتا تھا۔ ہم بڑی ہو گئیں۔ میری بڑی بہن نے بی۔ اے کر لیا اور میں نے ایم۔ اے۔ لیکن باباجی کی نگاہ میں ہم اتنی کی اتنی ہی رہیں۔ وہ ککو جی اور میں بے بی۔ اس لئے ہمارے وقت کا حصہ بھی نہ بڑھا۔

اس بار میری بہن نے اپنا وقت مجھے دے دیا ہے اس لئے میں ذرا تفصیل سے بات کر سکوں گی، ورنہ باباجی راستے ہی میں کہہ دیتے۔ ہُن بے بی بس کر۔

آپ بزرگوں نے فکرِ خام کے نمونے دیکھے۔ ہر ایک نے اس کی ہنسی اڑائی۔ جی بھر کر مذاق کیا۔ نئی نسل کو فکرِ خام کا حامل قرار دیا۔ اس لئے یہ تحقیر و تضحیک بالواسطہ اسی نسل کی ہوتی۔ بہت اچھا۔ یونہی سہی۔

تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر

لیکن میں آپ کے سامنے فکرِ پختہ کے کچھ نمونے پیش کرنا چاہتی ہوں۔ انہیں غور سے سنیئے اور پھر سوچئے کہ ان کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ یہ پختہ فکر ان بزرگانِ کرام کی ہے جن کا ذکر ہزار احترام سے کیا جاتا ہے اور جن کا نام لیتے وقت ہم سے کہا جاتا ہے کہ اپنے سر دوپٹوں سے ڈھانپ لو۔

حضرت خواجہ معین الدین اجمیری (رحمۃ اللہ علیہ) کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوہ قاف کو پیدا کیا۔ وہ پہاڑ زمین سے چالیس گنا زیادہ وسیع ہے (یعنی وہ پہاڑ ہے تو زمین پر لیکن زمین سے چالیس گنا زیادہ وسیع ہے) اسے ایک گائے اپنے سر پر رکھے ہے۔ درازی اس گائے کی تیس ہزار سال کی ہے۔ سر اس کا مشرق میں اور دُم مغرب میں ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ جس مجلس میں خواجہ مودود چشتی نے یہ بات بیان کی تھی اس میں ایک درویش بیٹھے تھے۔ ان کے دل میں اس کی بابت کچھ شک گذرا۔ حضرت خواجہ مراقبہ میں چلے گئے اور آپ اور وہ درویش اپنے اپنے خرقوں سے گم ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد واپس آئے تو اس درویش نے قسم کھا کر کہا کہ حضرت خواجہ نے مجھے وہ پہاڑ دکھا دیا ہے۔ اب مجھے کسی قسم کا شک نہیں رہا۔

ایک اور مجلس میں آپ نے فرمایا کہ جس روز اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو پیدا کیا اُسی روز ایک سانپ بھی پیدا کیا۔ سانپ سے کہا کہ ہم تیرے سپرد اپنی ایک امانت کرنا چاہتے ہیں تمہیں منظور ہے یا نہیں۔ اُس نے کہا کہ بسر و چشم منظور ہے۔ حکم ہوا کہ اپنا منہ کھول دے۔ اُس نے منہ کھولا تو فرشتوں کو حکم ہوا کہ دوزخ کو لاؤ اور اس کے منہ میں رکھ دو۔ فرشتوں نے ایسا ہی کیا اور پھر اُس سانپ کا منہ باندھ دیا۔ اب دوزخ اُس سانپ کے منہ میں ہے اور سانپ ساتویں زمین کے نیچے۔ اگر دوزخ سانپ کے منہ میں نہ ہوتا تو تمام عالم جل جاتا۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ میں اپنے پیر و مرشد کے ہمراہ سفر میں تھا۔ دجلہ کے کنارے پہنچے تو دریا میں طغیانی آرہی تھی اور پار اُترنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ میں متفکر ہوا تو حضرت نے فرمایا کہ آنکھیں بند کر و۔ میں نے بند کر لیں۔ پھر فرمایا کہ کھول دو۔ آنکھیں کھولیں تو ہم دونوں دجلہ کے پار تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کیسے ہوا۔ فرمایا کہ پانچ مرتبہ الحمد شریف پڑھ کر پانی پر قدم رکھا اور پار اُتر گئے۔

حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر (علیہ الرحمۃ) کے ملفوظات میں ہے کہ خواجہ ابو سعید ابوالخیر ذکرِ خدا میں مشغول تھے کہ اُن کے بالوں کی جڑ سے خون بہنے لگا۔ اہلِ خانہ نے اُن کے نیچے ایک طشت رکھ دیا۔ وہ طشت خون سے بھر گیا تو انہوں نے اُسے اٹھا کر پی لیا۔

پھر فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک دہی بیچنے والا سڑک کے کنارے کھڑا رو رہا ہے۔ دریافت کرنے پر اس نے کہا کہ میرا دہی زمین پر گر گیا تھا۔ زمین اُسے پی گئی ہے۔ آپ نے کوڑا اٹھا کر زمین سے کہا کہ تو دہی واپس دیتی ہے یا نہیں۔ یہ سنتے ہی زمین پھٹ گئی اور دہی اُوپر نکل آیا۔ دہی والے نے اپنا سبوچہ دہی سے بھر لیا اور چل دیا۔

پھر فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ اپنی گدڑی سی رہے تھے اور پشت آپ کی سورج کی طرف تھی۔ سورج کی گرمی سے آپ کی پشت تپ گئی تو آپ نے قہر آلود نگاہ سے سورج کی طرف دیکھا۔ معاً خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ سورج کا نور محو کر لیا جائے کہ اس نے عمرؓ سے گستاخی برتی ہے۔ فرشتوں نے فی الفور تعمیل کی اور سورج سے روشنی چھین لی۔ ساری دنیا تاریک ہو گئی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس زمانے میں حیات تھے۔ از حد غمناک ہوئے۔ فرمانے لگے کہ شاید قیامت قائم ہو گئی ہے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ جبریل نازل ہوئے اور فرمانے لگے کہ یا رسول اللہ قیامت قائم نہیں ہو گئی، سورج نے حضرت عمرؓ سے گستاخی کی ہے اس لئے اس کا نور چھین لیا گیا ہے۔ حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو طلب فرمایا اور سورج کی شفاعت کی۔ آپ نے سورج کو معاف کر دیا تو فی الفور جہاں روشن ہو گیا۔

ایک مجلس میں فرمایا کہ رسول اللہ کے زمانے میں ایک شخص کے ہاں دو بچے ایسے پیدا ہوئے جن کے جسم ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ وہ شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ان بچوں کو الگ الگ کرنے کی کوئی تدبیر فرمائیں۔ آپ متفکر ہوئے تو جبریل نازل ہوئے اور کہا کہ ان دونوں بچوں کے سر پر ایک ہی کنگھی پھیر دی جائے۔ ایسا کیا گیا تو بچے الگ الگ ہو گئے۔

اپنی خواجہ صاحب کے حالات میں مذکور ہے کہ آپ دن بھر مسجد میں عبادت کرتے اور رات کو ایک رسہ اپنے پاؤں میں باندھ کر کنوئیں میں الٹے لٹک جاتے اور رات بھر اسی طرح عبادت میں مشغول رہتے۔ پھر آپ جنگل میں چلے گئے اور وہاں عبادت کرتے رہے۔ ایک دوپہر پیاس کی شدت بڑھی تو آپ ایک کنوئیں پر پہنچے۔ کنوئیں کا پانی گہرا تھا اور آپ اس فکر میں تھے کہ رسی اور ڈول کہاں سے لائیں کہ اتنے میں دو ہرن کنوئیں پر آئے۔ آپ نے دیکھا کہ پانی کنوئیں کے کناروں سے اچھل پڑا ہے۔ ہرنوں نے پانی پیا اور چل دیئے۔ آپ پانی پینے کے لئے آگے بڑھے تو پانی پھر نیچے اتر گیا۔ آپ حیران ہوئے تو آواز آئی کہ تم نے رسی اور ڈول پر بھروسہ کیا اور ہرن ہمارے بھروسے پر آئے۔ ہم نے انہیں پانی پلا دیا۔ اس پر آپ کو سخت ندامت ہوئی۔ چالیس دن تک چلہ کشی کی۔ چالیس دن کے بعد بھوک نے تنگ کیا تو آپ نے چند کنکر منہ میں ڈال لئے۔ وہ کنکر منہ میں جا کر شکر کی ڈلیاں بن گئے۔ اسی وجہ سے آپ کو گنج شکر کہا جاتا ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا کہ حضرت سلیمان کے باورچی خانے میں ستر ہزار اونٹ روزانہ نمک لاتے تھے اور وہ روزانہ خرچ ہو جاتا تھا۔ ستر ہزار اونٹوں پر لدے ہوئے نمک سے جس قدر کھانا پکتا تھا، اس کا حساب لگانا میرے آپ کے بس کی بات تو ہے نہیں! یا شاید نمک چاٹ کر ہی گزارہ کر لیتے ہوں۔

ایک دفعہ فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام بہشت سے لنکا میں اترے تھے۔ تین سو سال تک اپنی لغزش کی بنا پر روتے رہے۔ چنانچہ گوشت پوست ان کے رخساروں کا بہہ گیا۔ چڑیوں نے اس میں گھونسلے بنا لئے اور آپ کو اس کا احساس تک نہ ہوا۔ آپ کے آنسوؤں سے زمین اس قدر تر ہو گئی کہ اس پر گھاس اگ آئی اور اتنی بلند ہو گئی کہ آپ اس میں چھپ گئے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ اماں حوا بیچاری انہیں ڈھونڈتی رہی اور وہ ملے ہی نہیں۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ ایک بڑھیا روتی ہوئی حضرت مودود چشتی کے پاس آئی اور کہا کہ میرے اکلوتے بیٹے کو بادشاہ نے ناحق مروا دیا ہے۔ یہ سنکر آپ سر دار تشریف لے گئے اور اس لڑکے کی لاش سے کہا کہ اگر تو ناحق مارا گیا ہے تو اٹھ کھڑا ہو۔ لڑکا اسی وقت زندہ ہو گیا۔

بزرگانِ محترم! آپ فکرِ پختہ کے نمونے ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ دو ایک اور دیکھئے۔

شاہ شمس تبریز ملتان کے مشہور بزرگ ہیں۔ اُن کے سوانح حیات میں لکھا ہے کہ بادشاہِ وقت کو آپ سے بڑی عقیدت تھی لیکن علمائے کرام اُن کے سخت مخالف تھے۔ علماء نے فتویٰ دے دیا کہ انہیں شہر بدر کر دیا جائے۔ بادشاہ نے کہا کہ مجھے خوف ہے کہ ایسا کرنے سے مجھ پر کوئی آفت نہ آ جائے۔ انہوں نے کہا کہ آپ انہیں شہر بدر کر دیجئے۔ اگر آپ کا بال بھی بیکا ہو گیا تو ہمارا ذمہ۔ بادشاہ نے شاہ شمس تبریز کو شہر بدر کر دیا تو اُس کا بیٹا فوت ہو گیا۔ بادشاہ نے علماء کو بلایا اور کہا کہ فوراً اُس فقیر کو منا کر لاؤ ورنہ میں تم سب کو قتل کر دوں گا۔ وہ آپ کی خدمت میں پہنچے اور منت سماجت کر کے انہیں لے آئے۔ آپ نے آ کر دعا کی اور بچہ کلمہ پڑھتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ لیکن علماء نے پھر آپ کے خلاف فتویٰ دے دیا اور فیصلہ دیا کہ ان کی زندہ کھال اتروا دی جائے۔ آپ نے اپنے اوپر کی اُدھڑی کھال اُتار کر اُن کے حوالے کر دی (جیسے کوٹ اُتار کر ڈرائی کلینر کو دیتے ہیں)۔ انہوں نے شام تک اُس کی تشہیر کی۔ آپ نے شام کو اُسے میکرر زیب تن کر لیا اور شہر سے چلے گئے۔

جس شاہزادے کو آپ نے زندہ کیا تھا وہ آپ کا مرید ہو گیا تھا۔ اُسی کا واقعہ ہے کہ اُسے ایک دن بھوک نے ستایا تو جنگل سے ایک ہرنی آئی۔ آپ نے اُس ہرنی کے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ لیا۔ ہرنی کا زخم اسی وقت اچھا ہو گیا اور وہ جنگل کی طرف بھاگ گئی۔ گوشت کے اُس ٹکڑے کو بھوننے کے لئے اہلِ شہر نے انہیں آگ نہ دی تو آپ نے سورج سے کہا کہ تو نیچے آ جا چنانچہ وہ سوا نیزے پر آ گیا تو آپ نے گوشت بھون لیا لیکن اس کے ساتھ ہی اہلِ شہر بھی گرمی کی شدت سے بھن گئے اور وہ اب تک بھنتے چلے جا رہے ہیں۔

بزرگانِ من! میں نے فکرِ پختہ کے جو نمونے پیش کئے ہیں ممکن ہے آپ کا یہ خیال ہو کہ ان کا تعلق تکیوں اور خانقاہوں سے ہے، علمی دنیا سے نہیں لیکن تکیے اور خانقاہیں ہوں یا مکتب اور دارالعلوم، پختہ فکر ہر مقام پر ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ دیوبند جیسا بلند پایہ دارالعلوم اور کہاں ہو گا؟ وہاں سے شائع ہونے والے ماہنامہ "تذکرہ" میں لکھا تھا کہ ایک دفعہ نانوتہ میں ملیریا بخار کی بڑی کثرت ہوئی تو جو شخص مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کی قبر سے مٹی لے کر باندھ لیتا اُسے فوراً آرام ہو جاتا۔ چنانچہ لوگ اُن کے مزار سے اس قدر مٹی لے جانے لگے کہ جب بھی مٹی ڈالی جاتی تو وہ جلد ختم ہو جاتی۔ جب یہ کیفیت ہوئی۔ تو ایک دن آپ کے صاحبزادے نے قبر پر جا کر کہا کہ حضرت! ہماری جان گئی آپ کی اواکاری۔ ہم قبر پر مٹی ڈالتے ڈالتے تنگ آ گئے ہیں۔ اگر آپ کے کوئی شخص اچھا ہوا تو ہم مٹی نہیں ڈالیں گے۔ سو اس کے بعد کسی کو آرام نہیں ہوا۔ اور لوگوں نے مٹی لے جانا بند کر دیا۔

ایک واقعہ یہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک شخص کا مقدمہ سہارنپور کے ڈپٹی کی عدالت میں پیش ہوا۔ وہ شخص حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے ایک تعویذ دیا اور کہا کہ اُسے اپنی پگڑی میں رکھ کر عدالت میں چلے جانا۔ وہ عدالت میں گیا تو تعویذ بھول گیا۔ اُس نے ڈپٹی صاحب سے کہا کہ وہ تعویذ بھول گیا ہے اُسے تھوڑی سی مہلت دے دی جائے۔ ڈپٹی صاحب تعویذوں گنڈوں کے قائل نہیں تھے۔ وہ ہنسے اور اُسے اجازت دے دی۔ وہ تعویذ پگڑی میں رکھ کر عدالت میں گیا۔ ڈپٹی صاحب نے جی بھر کر اُس کا مقدمہ خراب کیا۔ فیصلہ اس کے خلاف لکھا۔ لیکن جب فیصلہ پڑھ کر سنایا تو وہ اُس کے حق میں تھا۔ ڈپٹی صاحب دوڑتے ہوئے

حاجی صاحب کی خدمت میں آئے اور آپ سے معذرت چاہی۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے تعویذوں کا یہی اثر ہوتا ہے جس کے خلاف تعویذ دیا جائے اس کا دماغ خراب ہو جاتا ہے اور اس طرح ہم اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام کرا لیتے ہیں۔

میں اس قسم کی فکر پختہ کی مثالیں تو بے شمار پیش کر سکتی ہوں لیکن ڈرتی ہوں کہ آپا جی بس نہ کہہ دیں۔ اس لئے ان میں صرف ایک کا اضافہ کرنے کی اجازت چاہتی ہوں اور وہ ہے خود ہمارے لاہور کے ایک بزرگ حضرت میاں میر علیہ الرحمۃ۔ کے متعلق۔

آپ نے خاصی لمبی عمر پائی تھی۔ ایک دفعہ مسئلہ یہ چھڑ گیا کہ انسان کی عمر بڑھ سکتی ہے یا نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں! عمر بڑھ سکتی ہے۔ ایک شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی عمر پہلے سے مقرر کر رکھی ہے اسلئے اسے بڑھایا کیسے جا سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے عمر نہیں مقرر کر رکھی ہوتی بلکہ یہ مقرر کر رکھا ہوتا ہے کہ اس شخص نے دنیا میں اتنے سانس لینے ہیں۔ اسی لئے موت کے وقت کہتے ہیں کہ اس شخص نے آخری سانس لیا۔ سو سانس مقرر ہوتے ہیں۔

آپ نے کہا کہ ہم نے ایسا طریق اختیار کر رکھا ہے کہ دن رات میں ایک یا دو سانس لیتے ہیں۔ اس لئے مقررشدہ سانسوں کی گنتی کتنے ہی لمبے عرصہ میں جا کر ختم ہوگی۔ اس طرح انسان کی عمر بڑھ سکتی ہے۔

حماقت معاف ہو تو عرض کروں کہ ایسا نظر آتا ہے کہ پہلے اللہ میاں نے عمر کے تعین کے لئے دانہ پانی کو معیار قرار دیا یعنی یہ طے کیا کہ فلاں شخص کے حصے کا اتنا دانہ پانی ہے۔ بزرگان کرام نے اپنی عمر بڑھانے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی کہ وہ دن رات میں چند دانے گیہوں کھا کر گذارہ کر لیتے تھے۔ حتیٰ کہ خواجہ فرید الدین گنج شکر نے یہاں تک فرمایا کہ میں بیس سال عالم تفکر میں کھڑا رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس بیس سال میں کچھ کھایا ہو۔ اس طرح انہوں نے اپنے حصے کا دانہ پانی لمبے عرصہ میں جا کر ختم کیا۔ اس کے بعد اللہ میاں نے اناج کے بجائے سانس مقرر کر دیئے۔ اب ان بزرگوں نے چوبیس گھنٹوں میں دو ایک سانس لے کر عمر بڑھانی شروع کر دی۔ معلوم نہیں اس کے بعد اللہ میاں نے عمروں کے تعین کا کیا طریق مقرر کیا؟

(٥)

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ فکر خام انسان کو حیوان بنا دیتی ہے۔ اگر وہ آج زندہ ہوتے تو میں ان سے پوچھتی کہ اس قسم کی پختہ فکر سے انسان کیا بنتا ہے؟ لیکن ان سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ قدم قدم پر آپ کو بتایا جائیگا کہ اس علم سے انسان فوق البشر بن جاتا ہے۔ خود ہی ایسا نہیں بن جاتا بلکہ ایک نگاہ میں دوسروں کو بھی اسی مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ انسانوں ہی کو نہیں بلکہ حیوانوں تک کو بھی۔ چنانچہ حضرت خواجہ قطب عالم نے فرمایا کہ بدخشاں میں ایک بزرگ تھے۔ انہوں نے حاکم وقت کو حکم دیا کہ ایک خانقاہ تیار کرو۔ اس نے خانقاہ تیار کرائی تو آپ نے حکم دیا کہ ہر روز بازار سے ایک کتا خرید کر لائیں۔ حسب الحکم روز کتے خرید کر لاتے تو آپ ان کا ہاتھ پکڑ کر سجادہ پر بٹھا دیتے اور فرماتے۔ خدا کے سپرد کیا۔

آخر الامر وہ کتے ایسے ہو گئے کہ ہر ایک ان میں کا پانی کے اوپر چلتا تھا اور جس کسی کو وہ نقش دے دیتا وہ اچھا ہو جاتا۔ یہ علم انسان کو ایک طرف کتوں تک کو اس مقام پر پہنچا دیتا ہے! ــــ یہ ہے وہ فکر پختہ ــــ جس کی طرف

فکرِ خام" رکھنے والی نئی نسل کو دعوت دی جاتی ہے۔ امام غزالی نے عمر کا آدھا حصہ فلسفہ پڑھایا اور اسے فکرِ خام قرار دے کر عمر کا باقی آدھا حصہ اس کی تردید میں صرف کر دیا اور اسے فکرِ پختہ سے تعبیر کیا یعنی عمر کے آدھے حصہ میں جو بُنا باقی عمر اس کے ادھیڑنے میں صرف کر دی۔ قرآن مجید کی تشبیہ کے مطابق اس بڑھیا کی طرح جس نے سارا دن محنت سے سوت کاتا اور شام کو اسے خود ہی ادھیڑ دیا۔ غزالی کے معنی بھی سوت کاتنے والا ہیں۔

یہ ہے میرے بزرگو! وہ پختہ فکر جس کی دعوت قوم کے تعلیم یافتہ نونہالوں کو دی جاتی ہے۔ آپ سوچئے کہ وہ اس فکر کو کیسے قبول کرلیں۔ اس سے مجھے خود اپنے ہاں کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ہمارے گھر کے صحن میں امرودوں کے پیڑ ہیں۔ ان میں بڑے لذیذ میٹھے امرود لگتے تھے جنہیں ہم بچے بڑے شوق سے کھاتے۔

معلوم اس کے بعد ان پیڑوں کو کیا ہوا کہ جو امرود پکتا اسے کاٹتے تو اندر سے کیڑے نکلتے۔ ہم بہت پریشان ہوئے بالآخر ہم نے اس کا علاج یہ سوچا کہ کسی امرود کو پکنے ہی نہ دیتے۔ کچے ہی توڑ کر کھا جاتے۔ باباجی ہزار منع کرتے لیکن ہم چوری چھپے کچے امرود کھا جاتے۔ جب باباجی نے دیکھا کہ ہم کچے امرود کھانے سے باز نہیں آتے تو انہوں نے اپنے ایک دوست سے جو فنِ باغبانی کے ماہر تھے مشورہ کیا۔ اس نے ان پیڑوں کا علاج کیا اور اس کے بعد پکے ہوئے امرودوں میں کیڑا نہیں لگا۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ کچے امرود کھانے چھوڑ دیئے اور پکے امرود کھانے لگ گئے۔

سو بزرگانِ کرام! اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم بچے فکرِ خام کی طرف نہ لپکیں تو ہمیں ایسی پختہ فکر دیجئے جس میں کیڑے نہ ہوں۔ لیکن آج تو پاکستان میں شاید ہی کوئی پیڑ ایسا ہو جس کے پھل میں کیڑے نہ ہوں۔

آپ کس کس پیڑ کا علاج کریں گے؟ — یہاں تو باغ ہی نیا لگانا پڑے گا!

○

تتمہ۔ محمد احمد۔ لائلپور

مقالہ مذاکرہ میں پڑھا نہیں گیا تھا!

صدرِ محترم و معزز سامعین!

علامہ اقبالؒ نے تو صرف یہی کہا تھا کہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

جبکہ قرآن کے اصولوں کے مطابق خام فکر کے حامل انسان حیوان ہی نہیں بلکہ اس سے بھی پست سطح پر ہوتے ہیں کیونکہ حیوان تو وہ ہے جسے فکری صلاحیتیں ودیعت ہی نہ کی گئی ہوں جنہیں یہ صلاحیتیں دی گئی ہوں اور وہ ان سے کام نہ لیں تو انہیں حیوانوں سے پست سطح پر ہونا ہی چاہیئے۔

صدرِ محترم! آزادی اور آزادیٔ افکار ہر قوم اور ہر انسان کا پیدائشی حق مسلم لیکن آزادیٔ افکار کے لئے فکر کا پختہ ہونا ضروری ہے۔ اور پختگیٔ افکار ناممکن ہے جب تک فکر کی ہر افتاد اس سرچشمۂ علم و یقین سے ہم آہنگ و یک رنگ

نہ ہو جائے جس میں شکوک و اضطراب کو کوئی دخل نہیں اور جس کا آغاز سخن "لاریب فیہ" کے زلزلہ انگیز دعویٰ حقیقت کشا سے ہوتا ہے اور جو بنی نوع انسان کی بھلائی کا دعوے دار ہے۔ گویا پختہ افکار بنی نوع انسان کی بھلائی کے ضامن ہیں۔ جبکہ خام فکر انسان کو اور اقوام کو انسانیت کے معیار سے بہت نیچے گرا دیتے ہیں۔

معزز خواتین و حضرات! امت مسلمہ اسی خام فکری کی بنا پر صدیوں سے نکبت و زبوں حالی کا شکار چلی آ رہی ہے تو علامہ اقبالؒ نے اس مرض کہن کا علاج RECONSTRUCTION OF THOUGHT میں ڈھونڈا۔ چونکہ افکار کی پختگی کا اندازہ ان کو عملی طور پر نافذ کرنے سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے حکیم الامت نے برصغیر کے مسلمانوں کو آئیڈیالوجی کی بنیاد پر ایک مملکت قائم کرنے کا تصور دیا تاکہ اس میں اس ضابطہ حیات کو عملی طور پر نافذ کیا جا سکے جو بنی نوع انسان کی بھلائی کا ضامن ہے اور جسے رسول اللہ والذین معہٗ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا تھا۔

معزز سامعین! وہ مملکت جغرافیائی طور پر تو معرض وجود میں آئی مگر اس کی نظریاتی اساس صدر اول کے اسلام کی طرح ایک گہری سازش کا شکار ہو گئی۔ عقل و فکر کے چراغ گل کر کے قوم کو اندھی جذباتیت کا خوگر بنا دیا گیا۔ پاکستان کی اساس سے پہلو تہی کر کے سستے نعرے تھما دیئے گئے۔ اہل غرض اور ارباب ہوس نے اس جذباتیت سے خوب فائدے اٹھائے۔ ملائیت نے اسلام اور اسلام پسندی کا نعرہ لگا کر قرآن کا نام لینے والوں کی کفر کے فتووں سے نوازش کی اور قوم کو صبر و شکر کی تلقین کی کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب کچھ خدا کی طرف سے ہی ہے غرضیکہ امراء کی امارت بھی من جانب اللہ اور غربا کا افلاس بھی من جانب اللہ۔ اس طرح عوام کی صلاحیتوں کو شل کر دیا۔ اہل سیاست نے عوام کا نام لینے والوں کو غدار قرار دیا۔ سرمایہ دار اور جاگیردار نے اس سرزمین اور اس کے باسیوں کی شادابی کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا۔ اس دوران قوم کے ہونٹ اگر کچھ کہنے کو لرزے تو فوراً جذباتیت کے ذخیرے میں سے چند چلتے ہوئے مسائل نکال کر مداری کے تماشے کا سا منظر پیدا کر دیا گیا اور قوم کے ہونٹوں پہ کہنے کی بات یوں مر گئی جیسے آنسو پی لئے جاتے ہیں۔

صدر محترم! جذباتیت کے اس دور میں قوم سرابوں کا تعاقب کرتی رہی اور جنگلی عبرتناک شکست اور ذلت کے اس نشیب میں جا گری جس میں وہ آج پڑی ہے۔ اس المیئے کا رد عمل تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ عوام اس نظام کی گردن ناپتے جس نے ان کی ذلت کا سامان بہم پہنچایا۔ مگر صد حیف کہ یہ رد عمل عجیب تھا کیونکہ اندھی جذباتیت نے پھر ان کی آنکھوں کے سامنے دبیز پردے حائل کر دیئے اور قوم پھر اسی صبر و شکر کے فلسفہ پر عمل پیرا ہو گئی اور پھر پہلے کی طرح آس لگائے بیٹھ گئی کہ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔ یہ فلسفہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے والوں کا فلسفہ تھا۔ صبر و شکر کا یہ فلسفہ عوام کی قوتوں اور صلاحیتوں کو شل کر دیتا ہے۔

معزز سامعین! یہ ایک گہری سازش ہے۔ استبدادی قوتوں کے گٹھ جوڑ نے پاکستان کے جوڑ جوڑ کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ملا نے صبر و شکر کا فلسفہ دے کر اور عقل و فکر کے چراغ گل کر کے قوم کی صلاحیتوں کو شل کیا۔ ارباب اختیار نے عوام پر ذلت کی گندگی انڈیلی اور ایسا نظام مسلط کر دیا گیا جس میں احتیاج کا خوف دامنگیر رہنے لگا۔ اسی خوف کی بنا پر استحصال بڑھا، بدعنوانی بڑھی، بے اعتدالی بڑھی جس سے ملک کے داخلی نظام کا تار و پود بکھر گیا۔ معاشرہ متعفن ہو گیا، انسانی رشتے بے معنی ہو گئے۔ اوپر سے نیچے تک کی عادات بگڑ گئیں۔ خیر و شر کے معیار بدل گئے۔ اس صورت حال میں قوم لایعنیت، بے معنویت یعنی حیوانیت کا شکار ہو گئی۔ اور اب اگر اس سے کوئی بات پوچھی جاتی

ہے تو پوری کی پوری قوم کا یہ حال ہے کہ حیران و ششدر کھڑی دیکھ رہی ہے کہ کیا جواب دے۔ وہ قوم جس سے عقل و فکر چھین کر صبر و شکر کا فلسفہ تھما دیا گیا ہو وہ کہہ بھی کیا سکتی ہے؟ بقول احمد ندیم قاسمی۔

اظہارِ مدعا کی اجازت کا شکریہ! لیکن مری زبان تو واپس دلائیے
الفاظ سے صدا کی صفت کس نے چھین لی اس رہزنی کا کھوج تو پہلے لگائیے

میرے نزدیک تو رہزن وہ نظامِ معیشت ہے جس میں احتیاج کا خوف دامن گیر رہتا ہے اور جس نے ہمارے جذبے، ہمارے خیال اور ہماری فکر کو جکڑا ہوا ہے۔ اس نظام میں ہر فردِ معاشرہ اپنے آپ کو غیر محفوظ اور اپنے مستقبل کو تاریک سمجھتا ہے تو وہ اپنے اپنے مفادات کے پیچھے کچھ اس انداز سے دوڑتا ہے کہ کسی دوسرے کے مفاد کا قطعاً کوئی خیال نہیں کرتا بلکہ دوسروں کے مفادات کو حتی الوسع ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح یہ نظام چند کروڑ کا خون نچوڑ کر چند سو یا چند ہزار کا پیٹ بھرتا ہے۔ گویا ملتِ اولیٰ وہ نظامِ معیشت ہے جس میں احتیاج کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ اس کا علاج اس خوف سے نجات حاصل کرنے میں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ خوف دل سے نکالا کس طرح جا سکتا ہے؟

معزز سامعین! یہ خوف دور ہو سکتا ہے اور وہ اس وقت ممکن ہے اگر ہر فردِ معاشرہ کو اس امر کا پورا یقین ہو جائے کہ اس کی کوئی ضرورت رُکی نہ رہے گی، نہ ہی اس کو کوئی احتیاج ستائے گی۔ وہ کبھی بھوکا نہیں مر سکتا۔ اس کی اولاد کسی حالت میں بے کس و بے بس نہیں رہ سکتی۔ یعنی اسے اس امر کا یقین ہو جائے کہ اس کی اور اس کی اولاد کی تمام ضروریاتِ زندگی کا سامان موجود ہے ـــــ یہ یقین پیدا ہوتا ہے اس نظامِ ربوبیت کی رُو سے جس میں ہر فردِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی کا سامان بہم پہنچانا اس نظام کی ذمہ داری ہے۔ اور یہ سب کچھ ممکن ہے قوانینِ خداوندی کو عملی طور پر متشکل کرنے سے ان قوانین کو جن کی رُو سے ہر ذی حیات کو رزق پہنچانا خدا کی ذمہ داری ہے۔ انسانی دنیا میں خدا کا یہ دعویٰ رزاقیت و ربوبیت اس نظام کی رُو سے پورا ہوتا ہے جو اس کے قوانین کی بنیادوں پر خود انسانوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔ انسان کی دنیا میں مشیتِ خداوندی کی تکمیل انسانوں ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ یہی وہ نظام ہے جو انسان کو احتیاج کے خوف سے نجات دلا دیتا ہے۔

صدرِ محترم! اس نظام کے قیام کی پہلی منزل شعور کی بیداری ہے۔ شعور کی یہ بیداری اور فکر و نظر کی یہ تبدیلی اس نظام کے تصور کو عام کرنے اور اس کے درخشندہ نتائج کو نگاہِ بصیرت کے سامنے لانے سے ہوتی ہے۔ اس کا نام تعلیم کتاب و حکمت ہے۔ نبی اکرمؐ نے اسی نقطہ سے آغاز کیا تھا۔ اور آج جب اس تعلیم کو نظروں سے اوجھل کر دیا گیا ہے اور حکمت خرافات کی نذر ہو کر رہ گئی ہے تو ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ اسی نقطہ سے آغاز کر کے نظامِ ربوبیت کی تشکیل کی کوشش کی جائے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا پاکستان کا معرضِ وجود میں آنا بے معنی اور اس کا مستقبل خطرے میں ہے۔

ساتھیو! کتاب و حکمت کی تعلیم کا بیڑہ تو مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب نے اٹھا ہی رکھا ہے تو ہمیں چاہیئے کہ اس تعلیم کو عام کرنے کے لئے کوشش پیہم کریں۔ یہ سوچ کر جب ہر رات کا انجام صبح ہے تو یہ رات چاہے کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو آخر کار آفتاب کو طلوع ہونا ہی ہے کہ یہ قانونِ قدرت ہے، بہت تشویشناک ہے کیونکہ

خود بخود ٹوٹ کے گرتی نہیں زنجیر کبھی بدلی جاتی ہے بدلتی نہیں تقدیر کبھی!

ملا کے فلسفہ کو جھٹک دو۔ خدا کے قانون کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیئے

معمورۂ دوراں کی شرابوں کو بدل دیں، بد اب حافظ و خیام کے خوابوں کو بدل دیں
پردۂ رخ جاگیر و وراثت سے اٹھا کر ، تورات زر و سیم کے بابوں کو بدل دیں
ہر ہیکل جبروت کی بنیاد ہلا کر
تاریخ کی پارینہ کتابوں کو بدل دیں

یہ سب کچھ استبدادی قوتیں آسانی سے نہیں ہونے دینگی۔ کیونکہ انہوں نے پاکستان میں ایسے نظامِ تعلیم کو رائج رکھا ہے جس کی رُو سے وہ تعلیم حاصل کرنے والے یا تو استبدادی گروہ میں شامل ہو گئے یا ان کے پراپگینڈہ ایجنٹ بن کر رہ گئے۔ اور یہ استبدادی قوتیں پورے احساسِ تحفظ کے ساتھ من مانی کرتے ہوئے استحصال کرتی رہیں۔ اس کے لئے ہمیں اپنی جدوجہد کو تیز کرنا ہوگا۔ اپنے افعال کو جنوں خیز کرنا ہوگا۔ اپنی صداقت کا ثبوت بہم پہنچانے کے لئے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی و حیات میں بلند اقدار کی خاطر سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ پیدا کرنا ہوگا۔ حقیقت کو بے نقاب کرنے کے لئے ایک صحیح نظام کو حیات بخشنے کے لئے ہمیں موت کی تمنا کرنی چاہیئے۔

ساتھیو! انسانی شعور کو بیدار کرنے کے لئے جہدِ مسلسل سے کام کرتے ہوئے ایثار و قربانی کی مثالیں پیش کرتے ہوئے فکرِ قرآنی کو اس چمن کے چپے چپے تک پہنچا دیں۔ کیونکہ اس فکر کے بغیر آج ہم جہاں کھڑے ہیں بلکہ پڑے ہیں' وہ انسانوں کا مقام نہیں وہ حیوانیت کی سطح بھی نہیں بلکہ اس سے بھی کوئی پست سطح ہے۔ ہمیں ہر حال اس سطح سے اٹھنا ہے جو فکرِ قرآنی کے بغیر ناممکن ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ
إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ
جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED

مسئلہ قومیت

حضور نبی اکرمؐ نے خدا کا دین پیش کیا اور اس دین (نظامِ حیات) کو عملاً متشکل کرنے کے لئے ایک اُمت کی تشکیل فرمائی۔ دنیا کا جو شخص اس دین کی بنیادی صداقت کو تسلیم کر لیتا تھا وہ اس اُمت کا فرد بن جاتا تھا۔ بالفاظِ دیگر اس ہیئتِ اجتماعیہ کا معیار ایمان کا اشتراک تھا۔ یہ ایک ایسی مسلمہ حقیقت تھی کہ اس کے متعلق نہ کہیں کبھی کوئی اختلاف پیدا ہوا اور نہ ہی مسلمان امتوں میں تقسیم ہوئے۔ اسلام میں سینکڑوں غیر اسلامی نظریات شامل ہو گئے، اسکا اپنا نظام بھی باقی نہ رہا۔ اسکے تصورات میں انسانی خیالات کی آمیزش ہو گئی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن یہ حقیقت بڑی بصیرت افروز اور غور طلب ہے کہ وحدتِ اُمت کا تصور جو ان کے تحت الشعور کی گہرائیوں میں پیوست تھا، بدستور باقی رہا۔ وحدتِ اُمت کا تصور ہی نہیں بلکہ اسلام نے ان کی سیاسی مرکزیت کی وحدت کا بھی جو تصور دیا تھا، اس کے نقوش بھی آخر تک اُن کے ذہنوں سے نہ مٹنے پائے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی مختلف سلطنتیں قائم ہوئیں لیکن ان میں "خلافت" کا مقام ایک ہی مملکت کو حاصل رہا۔ یہاں تک کہ خلیفہ خواہ کتنا ہی کمزور ہوتا، باقی مملکتیں اس سے سندِ حکومت کی درخواست کرتیں۔ مثلاً مملکتِ عثمانیہ اپنے انتہائے عروج پر تھی اور عباسی خلفاء، مصر کے مملوک فرمانرواؤں کی حفاظت اور نگرانی میں اپنے دن بسر کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود بایزید خاں یلدرم جیسے جلیل القدر بادشاہ نے سلطان کا خطاب حاصل کرنے کے لئے عباسی خلیفہ معتصم باللہ کے پاس تحائف بھیج کر درخواست پیش کی اور اسکی اجازت اور منظوری سے اپنے آپ کو سلطان کے خطاب سے ملقب کیا۔ اس کے بعد ترکوں نے مصر کو فتح بھی کر لیا۔ لیکن از خود خلیفہ کا لقب اختیار نہ کیا تا آنکہ عباسی خلیفہ نے سلطان سلیم کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسے خلیفۃ المسلمین کہہ کر پکارا تو پھر خلافت عباسیوں سے عثمانیوں کی طرف منتقل ہوئی۔ اس کے بعد مسلمانوں کی حکومتوں میں خطبوں میں سلطانِ روم ہی کو خلیفۃ المسلمین کہہ کر پکارا جاتا رہا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے زوال کے بعد سلطانِ روم کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی، لیکن اس کے باوجود جب ترکوں نے خلافت کے ادارہ کو ختم کیا ہے تو دنیائے اسلام میں ہیجان برپا ہو گیا۔ ان تصریحات سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ اس لٹی پٹی اُمت میں بھی وحدتِ امت اور وحدتِ مرکز کا تصور ہمیشہ زندہ رہا۔ مسلمانوں کے باہمی ہزار اختلافات کے باوجود کسی ملک کے مسلمانوں نے نہ اپنے آپ کو الگ اُمت کہا اور نہ جداگانہ قوم۔ تا آنکہ یورپ نے ایک جدید نظریۂ قومیت وضع کیا۔ اس کی رو سے کہا یہ گیا کہ ایک ملک یا ایک مملکت کے اندر بسنے والے تمام لوگ ایک قوم کہلاتے ہیں۔ یہ قوم اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہے اور اسی قسم کی باقی اقوام سے بالکل جداگانہ حیثیت کی مالک ہوتی ہے۔ ان میں اور دوسری قوموں میں باہمی تعلقات، معاہدات کی رو سے استوار

ہو سکتے ہیں۔ جس قسم کے باہمی معاہدے اُس قسم کے باہمی تعلقات۔ ہماری بدقسمتی کہ خود مسلمانوں نے بھی اس نظریہ کو اپنا لیا اور اس طرح مسلمانوں کی مختلف مملکتوں میں جداگانہ قوموں کا تصور اُبھر آیا۔ یہ مملکتیں یا تو خالصتاً مسلمانوں پر مشتمل تھیں یا اُن کی آبادی میں بہت بڑی اکثریت مسلمانوں کی تھی، اس لئے قومیت کے اس نئے معیار کی رُو سے ان مملکتوں کے اندر بسنے والے مسلمانوں میں کوئی خاص پیچیدگی پیدا نہ ہوئی۔

جب ہندوستان میں۔ اپنی حکومت (سوراج) کے تصور نے انگڑائی لی، تو ہندو کی دوراندیشی نے مغرب کے نظریۂ قومیت میں اپنے غلبہ کا راز مضمر دیکھا۔ اس سے پہلے یہ بات ہندو کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آئی تھی کہ وہ اور ہندوستان میں بسنے والے مسلمان ایک قوم کے افراد ہیں ـــــ وہ تو مسلمان کے سایہ تک کو ناپاک سمجھتے تھے، اور اس چھت کے نیچے پانی پینا بھی ناجائز تصور کرتے تھے جس کے نیچے کوئی مسلمان بیٹھا ہو۔ لیکن آنے والے سیاسی غلبہ کے تصور نے ان تمام نظریات کو ایک طرف رکھ دیا اور اُس نے ہندوستانی قومیت کا نعرہ بلند کیا۔ یہاں بھی ہماری بدقسمتی کہ خود مسلمانوں کے اچھے اچھے نامور لیڈروں نے بھی ہندوؤں کی ہمنوائی میں یہی پکار شروع کر دی اور اتنا بھی نہ سوچا کہ اس نئی قوم کی "اپنی حکومت" میں ہندوؤں کی اکثریت کے ہاتھوں، مسلمان کی مستقل اقلیت کا کیا حشر ہوگا۔ حیرت اور حیرت کہ اس نظریۂ قومیت میں وہاں کے بیشتر علماء حضرات بھی شریک ہو گئے اور انہوں نے اتنا بھی خیال نہ کیا کہ قومیت کا یہ تصور اسلام کے بنیادی تصور کے خلاف ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس کے خلاف آواز بلند کی تو اُن کی سب سے بڑی مخالفت انہی نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہوئی۔ ان میں مولانا حسین احمد مدنی مرحوم پیش پیش تھے۔ اقبال نے جب اس موضوع پر ایک حقیقت کشا بیان شائع کیا تو مولانا مرحوم سے اس کا کوئی جواب نہ بن پڑا اور انہیں یہ کہنا پڑا کہ ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اسلام کی رو سے معیارِ قومیت اشتراکِ وطن ہے۔ انہوں نے کہا صرف یہ تھا کہ آج کل قومیں وطنیت کے اشتراک کی بنا پر متشکل ہوتی ہیں۔ اس وقت تو یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا، لیکن علامہ اقبال کی وفات کے بعد ایک کتابچہ شائع کر دیا جس میں کہا کہ اقبال کا دعویٰ غلط تھا۔ اسلام کی رو سے اشتراکِ وطن قومیت کا معیار قرار پا سکتا ہے اور اسی بنا پر ہم ہندوستانی قومیت کے مؤید اور مدعی ہیں۔

وہ دور ختم ہو گیا۔ پاکستان وجود میں آ گیا لیکن یہ نظر آتا ہے کہ پاکستان میں آ جانے کے بعد بھی متحدہ قومیت کے ان حامیوں کے قلب و دماغ سے وہ نظریۂ وطنیت مٹا نہیں ـــــ یہی نہیں کہ وہ مٹا نہیں بلکہ اس نے اور شدت اختیار کر لی ہے۔ ہندوستان میں بسنے والے لوگوں نے، خواہ وہ ہندو ہوں۔ یا مسلمان، کبھی یہ نہیں کہا کہ وہاں مختلف صوبوں میں بسنے والے لوگ یا مختلف زبانیں بولنے والے الگ الگ قومیتیں رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کا مسلک یہی ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام لوگ ایک قوم کے افراد ہیں، لیکن ان قدیم نیشنلسٹوں نے یہاں یہ مؤقف اختیار کر رکھا ہے کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں میں بسنے والے لوگ چار قومیتیں ہیں یا پھر مختلف نسلوں سے متعلق یا مختلف زبانیں بولنے والے لوگ الگ الگ قومیت رکھتے ہیں۔

طلوعِ اسلام، قرآنی تصوراتِ زندگی کا پیغامبر ہے، اس لئے یہ اس کا فریضہ تھا کہ وہ مغربی نظریۂ وطنیت کے خلاف آواز اٹھاتا۔ اس نے ہندوستان میں بھی یہ آواز اٹھائی اور یہاں آنے کے بعد بھی گذشتہ چھبیس سال سے مسلسل اپنی استطاعت کے مطابق اسے دہراتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا مؤقف یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے متعین کردہ معیارِ قومیت کی رُو سے تمام دنیا کے مسلمان ایک اُمّت (یا آج کی اصطلاح میں ایک قوم) کے افراد ہیں۔ اس سے پہلے

یہاں اس نظریہ کی مخالفت کھلے بندوں نہیں ہوتی تھی لیکن سانحۂ مشرقی پاکستان کے بعد مغربی پاکستان میں یہ مخالفت بلند آوازیں اختیار کر گئی ہے۔ یہ حضرات یا تو وہی ہیں جو ہندوستان میں نیشنلزم کے حامی تھے یا وہاں کے نیشنلسٹ علماء کے معتقدین اور مقلدین۔ یہ آزادی کا زمانہ ہے، اسلئے ہم کسی کے نظریہ یا خیال پر پابندی عائد نہیں کر سکتے لیکن جب کوئی شخص یا گروہ، کسی خلاف اسلام نظریہ کو مطابق اسلام کہہ کر پیش کرے تو ہمارا دینی فریضہ ہو جاتا ہے کہ ہم اس کی مخالفت کریں اور قرآن کی رو سے صحیح پوزیشن اس کے اور قوم کے سامنے رکھیں۔ اس سلسلے میں (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) ہم گذشتہ چھبیس سال سے وقتاً فوقتاً لکھتے چلے آ رہے ہیں۔ طلوع اسلام بابت جولائی ۱۹۷۳ء کے لمعات میں ان تفاصیل کو سمٹی ہوئی شکل میں یکجا کر دیا گیا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ اس واضح پوزیشن کے بعد کم از کم اسلام کے نام سے قرآنی نظریۂ قومیت کی مخالفت نہیں ہوگی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ حضرات اپنی ضد کو نہیں چھوڑ رہے۔ اس سلسلے میں ہمیں بہت سے خطوط موصول ہو رہے ہیں۔ ان ہی کا ایک خط ہم درج ذیل کرتے ہیں، جس سے نظر آ جائے گا کہ یہ حضرات کن خطوط پر سوچتے ہیں۔ اس خط پر نام اور پتہ درج نہیں۔ لیکن اس کا متن بتا رہا ہے کہ یہ صاحب کوئی پرانے نیشنلسٹ ہی ہیں۔ بہرحال آپ پہلے یہ خط ملاحظہ فرمایئے۔ ہم اس خط کو اس لئے بھی شائع کر رہے ہیں کہ اس میں بات ذرا کھل کر کی گئی ہے۔

جولائی کے لمعات کی ابتداء اگرچہ نامناسب حد تک تیز و ترش تلخ نوائی سے کی گئی ہے۔ تاہم چند اہم مسائل کے بعض گوشے کسی قدر روشن ہوئے ہیں۔ لیکن معاملہ زیر بحث اب بھی تشنہ ہے۔

(۱) دو گروہوں کے تقسیم کے باوجود جب فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ عَدَاوَةٌ یا میثاق پیش کیا جاتا ہے۔ تو آپ کسی قرآنی حکم یا دلیل پیش کئے بغیر اسے خاص وقت اور مقام میں محصور کر لیتے ہیں۔ اور جب وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا کا واضح قرینہ بھی موجود ہوتا ہے تو آپ اسے عام اور ابدی بتاتے ہیں۔

میں مشکور ہوں گا اگر اس گوشہ پر ہندی مسلمانوں کی موجودہ حالت۔ وہاں کے ہندوؤں کے ساتھ ان کے برتاؤ اور انکی قومیت کے پیش نظر روشنی ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ مدینہ کی اسلامی سلطنت کے حدود اسکے مالی نظام اور متعلقہ افراد کی تعداد کے بارہ میں ہجرت کا جو حتمی حکم دیا گیا تھا وہ آجکل کے ہندی مسئلہ پر منطبق نہیں ہو سکے گا۔ خصوصاً اس لئے کہ روئے زمین کے مسلمان سلطنتوں کے "کافر" اور "مشرک" مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والے "قرآنی مسلموں" پر بھی اسی حکم کا اطلاق ہوگا اور چھوٹا سا پاکستان ان سب کو اپنے ہاں نہ بلا سکتا ہے اور نہ بلا کر لبا سکیگا اور اگر آپ کے کہنے کے مطابق ہر جگہ اسی قومیت کا اعلان کیا جائے تو نام کے مسلمانوں کے، مسلمان ہونے سے قبل، سلامتی جو اسلام کا مقصد اور مفہوم ہے کے نقطۂ نگاہ سے دنیا کا کیا حال ہوگا۔ روس کی مثال اس پر صادق نہیں آسکتی کیونکہ وہاں ایک ہی متحد و منسلک ملک کا معاملہ تھا۔ یہاں مختلف اور مشترک ممالک کا قضیہ ہے۔ پھر بھی روس کو جو مشکلات پیش آئیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔

(۲) چار قومیتوں یا صوبائی خود مختاری یا لسانی قومیت کے مسئلے کو آپ نے کبھی بھی جذبات سے بالاتر ہو کر نہیں چھیڑا ہے میرا مطلب ہے۔ خالص قرآنی روشنی میں اس لیئے بعض قرآنی بھائی بھی آپ کے خیالات میں پنجابیت محسوس کرتے ہیں خصوصاً جب آپ ایک یونٹ کی تائید میں کچھ کہہ گزرتے ہیں۔ یا جب علامہ اقبال کی شاعری سے آپکے غیر معمولی شغف کو پیش نظر رکھا جاتا ہے جبکہ قرآن کریم میں " الشعراء یتبعھم الغاوٗن " موجود ہے۔ قرآن کریم تمام رسولوں کی تعلیم کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے " لسانِ قومہ " کو ذریعہ تعلیم قرار دیتا ہے۔ اور رسولوں کی تعلیم کا " نصاب " یُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ " قرار دیتا ہے اور اسی چیز کو تمام دنیا کے ماہرین تعلیم نے اپنے تجربے سے معلوم کر کے تعلیم کا بہترین اور سہل ترین ذریعہ مادری زبان کو قرار دیا۔ یہی قرآنی آیت ہے جس سے لسانی قومیت پیدا ہوتی ہے۔ خصوصاً " لسان قومہ " سے یعنی ایک ملک میں رہنے والے لوگوں کے مختلف گروہوں میں سے ہر ایک کے بچوں کو اُن کی مادری زبان میں تعلیم ملنی چاہیئے۔ چونکہ آج کل تعلیم اسی فیصد روزگار اور نوکری کے لیئے حاصل کی جاتی ہے اور کسی قدر پبلک کاموں کے لئے خصوصاً چھوٹے چھوٹے سرکاری اور غیر سرکاری کاموں کے لیئے پڑھے لکھے آدمی چاہیئے ہوتے ہیں مثلاً پٹواری منشی متصدی اہلمد۔ چھوٹے دکاندار وغیرہ اسلئے انکی مادری زبانوں ہی میں دفاتر کی ضرورت ہوتی ہے جس سے الگ صوبہ اور صوبائی دفاتر و اختیارات کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح خیرالقرون اور خلافت راشدہ میں حالات ہوا کرتے تھے ان ولایات کے والی ہر چند مرکز کے ماتحت ہوتے تھے اور اب بھی ہوتے ہیں کسی نہ کسی حد تک اور کسی نہ کسی دائرہ میں لازماً "صاحب اختیار ہوتے تھے اور ہونے چاہئیں جس کے معنی ہیں صوبائی خود مختاری اور چونکہ اس وقت والی کے ساتھ مجلس مشاورت مرکز کی طرح ہوا کرتا تھا انہیں آپ نامزد کہیں یا علم و تقویٰ کی بنیاد پر منتخب سمجھیں۔ آجکل وہ منتخب اسمبلی ہوتی اُن پر نگران مرکز کا نمائندہ گورنر ہوتا ہے۔ کیا ایران، شام، مصر، جزیرہ یمن، عراق وغیرہ میں مقامی زبانوں کے دفاتر مقامی مسلمان متصدی وغیرہ موجود نہ تھے۔ اگر امیر معاویہ با اختیار گورنر تھا اور صوبے کے مسائل پر قابض نہ ہوتا تو خلیفہ عثمان رضؓ کے قتل کے فوراً بعد اس قدر طاقتور اور مرکزی خلیفہ سے باغی اور انکا مدّ مقابل کیسے بنتا اور اگر ایران میں فارسی دفتری اور سرکاری زبان نہ ہوتی تو کیا وہ رومی اور مصری (قبطی) زبانوں کی طرح جو قبضہ کے وقت سرکاری زبانیں تھیں اور آبادی پر عرب مہاجرین کی اکثریت کے چھا جانے تک بھی تھیں مگر آبادی کے تناسب کے بدل جانے کے ساتھ متروک ہو گئیں یہ بھی متروک نہ ہو جائیں۔ یہ بات کہ صوبائی خود مختاری اور لسانی قومیت جو اگرچہ میرے خیال میں مندرجہ بالا ترتیب کے ساتھ " لسان قومہ " کا درست منطقی نتیجہ ہیں۔ لازماً مرکز گریزی کی علت ہوتے ہیں قطعی غلط ہے۔ جب تک مرکز درست طاقتور اور بنیادی مسلک پر قائم رہتا ہے تو ولایت کی تفاوت ممکن

نہیں۔ ابوبکرؓ عمرؓ کے عہد میں کیوں والی باغی نہ ہو سکے یا حال میں روس کی مسلم جمہوریتیں باغی نہیں ہوئیں حالانکہ انہیں علیحدگی کا آئینی حق بھی حاصل ہے۔ دراصل علیحدگی نتیجہ ہوتی ہے مرکز کی بے اعتدالی اور کمزوری کا جیسے مدینہ کی حکومت کے ساتھ ہوا جب وسیع و عریض سلطنت کے مرکز کا یہ حال تھا کہ اشتر وغیرہ کے ستر افراد نے عین دارالخلافہ کے درمیان خلیفہ کو قتل کیا۔ اور محافظات چلے گئے بلکہ نئے خلیفہ کے دست و بازو بنے۔ ایسے ناکارہ مرکز کا اقتدار کیسے قائم رہ سکتا تھا یا جیسے کہ پاکستان میں ہوا چھبیس سالوں میں پنجابی سرمایہ داروں کے ٹولے نے دو حطّے طرزِ حکومت کو قبول کیا جو اسلامی طرز کے زیادہ قریب تھا جس کی تائید چھوٹے صوبوں حتّٰی کہ خان عبدالغفار نے بھی کی ' اور نہ ہی موجودہ جمہوریت کے مطابق اکثریت کی حکومت کو قبول کیا حالانکہ اکثریت ابتداء میں قائداعظمؒ کی پارٹی اور پاکستان کے موجدوں کے پاس تھی۔ قائداعظم کے انہی انگریز گزیدہ وارثوں نے مساوات اور ایک یونٹ کا غیر اسلامی اور غیر جمہوری نظام جبراً اور مستقل بے آہنی کی دھمکی کے تحت منوایا اور اسکے تحت بنگال کو فوج اور چھوٹے صوبوں کو غیر اسلامی عددی اکثریت کے زور پر کھلنے اور ستانے لگے۔ پہلے کراچی اور پھر پنجاب ملکی دولت کا مرکز بنتا رہا۔ مانا کہ جب اسلامی نظام آئے گا اور اسکے تحت سرمایہ داری نظام دم توڑ دیگا تو لوٹ مار زبردست آزادی اور استحصال نہ رہے گا جس میں کچھ وقت ضرور لگیگا۔ تو آخر کب تک چھوٹے صوبوں کے مظلوم لوگ اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں بھی نہ ماریں اور دم گھٹ کر مر جائیں یہ مرضی ہے صیاد کی ہے۔ کا نمونہ بنے رہتے۔ ہمارے ساتھ کیا کیا ہوتا رہا ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ مختصراً یہ کہ غیر قرآنی نظام کے تمام آلات تعذیب و استحصال ہم پر مسلط تھے۔ مشکور ہونگا اگر اس مسئلہ پر مفصل روشنی ڈالیں مگر صرف قرآنی روشنی میں بدلایات کی ضرورت اور ان کی آزادی (محدود دائرہ میں) جو باہمی رضامندی اور ضروری تحفظات کے بعد طے ہو گی ' کی جس قدر مخالفت کی جائے گی اسی قدر چھوٹے صوبوں کے مظلوم عوام میں مرکز سے بیزاری اور علیحدگی پسندی بڑھے گی اور یہ مخالفت اگر اسلام کے نام پر ہو گی تو جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اسلام بلکہ دین و مذہب سے بغاوت بڑھے گی۔ جیسے روس میں ہوا تھا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جو مذہب ظلم کی حمایت میں استعمال ہو گا مظلوم اسے ٹھکرائیگا۔

اس خط کے آخر میں دو ایک استفسارات اور بھی ہیں لیکن چونکہ ان کا تعلق مسئلہ قومیت سے نہیں ' اسلیے ہم نے انہیں حذف کر دیا ہے۔ آیئے ہم اس خط کے دعاوی کا تجزیہ کر کے دیکھیں کہ قرآن کریم کی رو سے یہ کہاں تک مبنی بر حقیقت ہے۔

۲۔ تمہیداً اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ قرآن کریم عربوں کی زبان میں نازل ہوا ' اس لئے اس کے عمومی الفاظ کا مطلب اور مفہوم وہی ہو گا جو زبان (لغت) کی رو سے عربوں کے ہاں لیا جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد قرآن کریم ان میں سے بعض الفاظ کو اصطلاحی معنوں میں بھی استعمال کرتا ہے۔ اس لئے قرآنی آیات کا مفہوم سمجھنے کے لئے یہ سمجھنا ضروری

ہو گا کہ قرآن کریم نے ان الفاظ کو کہاں ان کے لغوی معنوں میں استعمال کیا ہے اور کہاں اصطلاحی معنوں میں۔ نیز اس کے بعض الفاظ نے بجائے اں دیگر زبانوں میں اصطلاحی مفہوم اختیار کر لیا ہے لہٰذا یہ بھی ضروری ہو گا کہ اس میں فرق کیا جائے کہ ان الفاظ کا قرآن کی رُو سے مطلب کیا ہے اور یہ اب جہاں بطور اصطلاح استعمال ہوتے ہیں، اُن اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے۔ قوم کا لفظ انہی میں شامل ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں عربی لغت میں قوم کا لفظ اُن اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتا تھا، جن معنوں میں آج قوم یا قومیت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ان کے لغت میں لفظِ قوم کا لفظ کچھ ایسے معنی میں استعمال ہوتا تھا، جیسے ہم کہتے ہیں کہ "وہاں کے لوگ" یا "وہاں کے باشندے" یا "فلاں قبیلے کے لوگ" وغیرہ۔ مثلاً جب قرآن کریم قوم نوحؑ کہتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں، وہ لوگ جن میں حضرت نوحؑ پیدا ہوئے۔ قوم نوحؑ سے مراد وہ لوگ نہیں تھے جو حضرت نوحؑ پر ایمان لا کر اُن کی اُمت میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح جب وہ کہتا ہے کہ ہر رسول کو "اُسکی قوم" کی زبان میں وحی دی گئی، تو اس کے معنی ہونگے اُن لوگوں کی زبان میں جن میں وہ رسول پیدا ہوا تھا، یا جن کی طرف وہ رسول بھیجا گیا تھا۔ یہ قوم نہ تو اُس رسول کی اُمت ہوتی تھی اور نہ ہی اس لفظ کا وہ مفہوم تھا جس مفہوم کے لئے یہ لفظ آج سیاست کی زبان میں بولا جاتا ہے۔ الفاظ کے معنی کے اس فرق کو سامنے رکھنے سے قرآنی آیات کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

صاحب مکتوب کو سابقہ قرآن مجید سے نیشنلزم کی تائید میں وہی آیت ملی ہے جس کا مفہوم ہم جولائی ۱۹۷۳ء کے لمعات میں بڑی وضاحت سے بیان کر چکے ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ ہم ایک ہی بات کو کتنی بار دہراتے چلے جائیں۔ مختصراً سورۃ النساء میں ہے کہ کسی مومن کے لئے یہ جائز ہی نہیں کہ کسی دوسرے مومن کو قتل کر دے۔ اگر کبھی سہواً ایسا ہو جائے تو مقتول کے وارثوں کو اُس کا خون بہا ادا کرنا ہو گا اس کی اسکے دو صورتیں بتائیں، ایک یہ کہ اگر مقتول اُن لوگوں میں رہتا تھا جسکے ساتھ تمہاری عداوت ہے تو اس کی شکل یوں ہو گی، اور اگر ان لوگوں میں، جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے تو پھر اس کی شکل یوں۔ اس کے لئے الفاظ یہ آئے ہیں۔ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ اور اِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ۔ اس سے یہ حضرات کہتے ہیں کہ دیکھئے! قرآن کریم اسے تسلیم کرتا ہے کہ ایک مسلمان غیر مسلم قوم کا فرد بن کر اُن میں رہ سکتا ہے۔ یعنی یہ لوگ ان آیات میں لفظ قوم کو اُن اصطلاحی معنوں میں لیتے ہیں جن میں یہ آجکل استعمال ہوتا ہے، اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس زمانے میں اس لفظ کے یہ اصطلاحی معنی تھے ہی نہیں۔ اس کے معنی انسانوں کا کوئی گروہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) جو نیشنلسٹ علماء کے سرخیل تھے وہ اس آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

اور اگر مقتول ان لوگوں میں سے ہو، جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ صلح ہے۔

یہی اُس زمانے میں لفظ قوم کا مفہوم تھا۔ یعنی وہ لوگ جن میں کوئی رہتا ہو۔ ابتدائے اسلام میں صورت یہ تھی کہ مختلف قبائل میں سے اکا دکا لوگ مسلمان ہو جاتے تھے اور ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا کہ وہ انہی لوگوں میں رہیں۔ یہ وہاں، ایک قوم کے افراد کی طرح بطیبِ خاطر راضی خوشی نہیں رہتے تھے بلکہ یہ امر مجبوری رہتے تھے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں یہ وہ لوگ تھے۔ اَلَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا

فی الارض (۴/۹۷) یعنی وہ مسلمان جو دین کی خاطر، اُن لوگوں میں گھر کر رہ گئے تھے اور وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتے تھے۔ یہ لوگ وہاں سے نکلنے کے لئے اسقدر بیتاب اور بیقرار تھے کہ خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگا کرتے تھے کہ یہاں سے ہمارے نکلنے کا کوئی سامان پیدا کر دے (۴/۷۵) ہم ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ کیا (آج کی اصطلاح میں) کسی قوم کے افراد کی یہی کیفیت ہوتی ہے؟ اس کے بعد جب مدینے میں مسلمانوں کی اپنی مملکت وجود میں آگئی تو ان لوگوں سے کہا گیا کہ وہ سب ادھر منتقل ہو کر آجائیں۔ اس کے بعد جن مسلمانوں نے اپنی غیر مسلموں میں رہنا پسند کیا تو قرآن کریم نے مسلمانوں سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ اُن کے ساتھ تمہارے دوستداری کے تعلقات نہیں رہ سکتے۔ اُن کا شمار انہی غیر مسلموں میں ہوگا اور اُن کے ساتھ بھی، انہی کیطرح جنگ کی جائے گی۔ (۴/۸۹، ۸/۷۲)

ذرا غور کیجئے کہ اگر مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ ایک قوم بن کر رہنا جائز ہوتا تو ان مسلمانوں کے متعلق اس قسم کے احکام کیوں نازل ہوتے؟

سورۃ النساء کی جس آیت (۴/۹۳) سے یہ حضرات متحدہ قومیت کی دلیل لاتے ہیں، اس سے اگلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر کوئی مومن، دوسرے مومن کو عمداً قتل کر دے تو اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور اس پر خدا کا غضب اور لعنت ہے۔ (۴/۹۳) مغربی نظریۂ قومیت کی رو سے قوموں میں باہمی جنگیں ہوتی ہیں اور ان جنگوں میں بلالحاظ مذہب، ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف جنگ کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ یہ اسی نظریۂ قومیت کا منطقی نتیجہ تھا کہ جب بھارت نے پاکستان کیخلاف جنگ کی ہے تو اُس کی فوج میں وہاں کے مسلمان، پاکستان کے مسلمانوں کے خلاف اسیطرح لڑ رہے تھے، جسطرح وہاں کے ہندوؤں اور سکھوں نے لڑائی لڑی تھی۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو اس نظریۂ قومیت کی رو سے ایک قوم کے مسلمانوں کو دوسری قوم کے مسلمانوں کے خلاف تلوار اٹھانی پڑتی ہے۔ کیا ان لوگوں پر خدا کے اس حکم کا اطلاق نہیں ہوگا جسکا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ آپ ذرا اس حقیقت پر بھی غور کیجئے کہ مدینہ میں مسلمانوں کی مملکت کے قیام کے بعد بھی بعض مقامات پر مسلمان غیر مسلموں میں گھر کر رہ گئے تھے ـــــ خود مکہ میں بھی کئی ایک مسلمان ایسے تھے۔ چھ سات برس تک ان غیر مسلموں کی لڑائیاں مدینہ کی مملکت کے خلاف ہوتی رہیں لیکن آپ کو تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملے گا، جس میں کوئی مسلمان اپنے ہم وطن غیر مسلموں کی فوج میں مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما ہوا ہو۔ انہوں نے غیر مسلموں کی تمام سختیاں برداشت کیں لیکن ایسی جنگوں میں اُن کا ساتھ دینا گوارہ نہ کیا۔ کیا مغربی نظریۂ قومیت کی رو سے بھی ایسا ممکن ہے؟

آپ اشتراکِ وطن کی بنیاد پر یا اس خود ساختہ سند کی بنا پر کہ قرآن نے ان کیلئے قوم کا لفظ استعمال کیا ہے، مسلمانوں اور غیر مسلموں کی متحدہ قومیت کا نظریہ پیش کرتے ہیں۔ دیکھئے کہ قرآن قوم کا لفظ استعمال کرنے کے بعد مسلمانوں اور غیر مسلموں میں کس قسم کے تعلقات کی راہنمائی دیتا ہے۔ قرآن کریم میں مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ تمہارے لئے ابراہیمؑ اور اس کے ساتھیوں کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ اس کے بعد وہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کی خصوصیات بتاتا ہے اور وہ خصوصیت یہ ہے اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ ـــــ جب انہوں نے اپنی قوم سے علی الاعلان کہہ دیا کہ ہمارا تمہارے ساتھ کوئی تعلق اور واسطہ نہیں، ہم تم سے یکسر بیزار ہیں، تم میں اور ہم میں

ہمیشہ کے لئے بغض اور عداوت رہے گی، اور یہ اُس صورت میں ختم ہو سکے گی کہ تم خدا پر ایمان لے آؤ (۶۰/۴)۔
آپ سوچئے کہ جو لوگ ایک قوم کے افراد ہوں، کیا ان میں باہمی تعلقات کی یہی کیفیت ہوتی ہے؟ آج کچھ ہندوستان کے مسلمانوں سے کہ وہ قرآن کی اس آیت کا ہندوؤں کے سامنے اعلان کریں اور پھر دیکھئے کہ وہ انہیں اپنی قوم کے افراد تسلیم کئے رہتے ہیں یا انہیں گولی سے اڑا دیتے ہیں؟

(۳) صاحبِ مکتوب نے اپنے خط کے باقی حصے میں یہ کہا ہے کہ آج کے حالات میں قرآنی نظریۂ قومیت کی رُو سے یہ دشواری پیش آئے گی، اور وہ دشواری پیش آئے گی۔ اس سوال کو بھی ذرا غور سے سمجھ لینا چاہیئے ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ آج قرآنی نظریات کے مطابق زندگی کہیں بھی بسر نہیں ہو رہی۔ اگر ہم اپنی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہتے تو ہمیں کھلے لفظوں میں یہ کہہ دینا چاہیئے کہ ہمیں اس سے کچھ واسطہ نہیں کہ اسلام کیا کہتا ہے۔ ہم سیکولر انداز کی زندگی بسر کریں گے۔ لیکن اس کے بعد پھر آپ میں اتنی جرأت بھی ہونی چاہیئے کہ آپ اپنے آپ کو مسلمان نہ کہیں۔

لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ اسلام کے مطابق زندگی بسر کریں تو اس کے لئے:

(۱) پہلے یہ متعین کرنا ہوگا کہ قرآن کریم کی رُو سے اسلامی زندگی کے بنیادی اصول، نظریات، تصورات اور مسالک کیا ہیں؟

(۲) اس کے بعد یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم اپنے موجودہ حالات کے پیشِ نظر اسلامی زندگی کی اس منزل تک رفتہ رفتہ بتدریج کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔ یہ عملی پروگرام کتنا ہی سُست رفتار کیوں نہ ہو، اسکی بنیادی شرط یہ ہوگی کہ اس میں آپ کا رُخ اُس منتہیٰ کی طرف ہو جسے قرآن نے متعین کیا ہے۔

(۳) یہ روش انتہائی منافقت کی ہوگی کہ آپ اسلامی نہج کی زندگی تو بسر نہ کرنا چاہیں لیکن اپنے آپ کو، یا دنیا کو، دھوکا دینے کے لئے اپنی غیر اسلامی زندگی کو اسلامی قرار دیتے چلے جائیں۔

صاحبِ مکتوب نے جن عملی مشکلات کا ذکر کیا ہے، وہ ہمارے سامنے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ اسلامی زندگی کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھنے کے بعد ان مشکلات کا حل دریافت کرنا چاہتے ہیں یا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظریاتِ حیات کسی زمانے میں تو ممکن العمل تھے لیکن موجودہ بدلے ہوئے حالات میں وہ ممکن العمل نہیں رہے۔
آپ بیشک یہ بھی کہہ دیجئے لیکن اس کے بعد آپ کو پارسیوں کی طرح ایک جداگانہ مذہب کا پیرو بننا ہوگا۔ مسلمان کہلاتے ہوئے تو یہ روش اختیار نہیں کی جا سکتی۔

اسلام اس سے قطعاً نہیں روکتا کہ آپ اپنے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم دیں۔ نہ ہی وہ اس سے روکتا ہے کہ آپ کھانے پینے، رہنے سہنے کے طرز اور انداز میں اپنے ہاں کے دستور اور رواج کے پابند رہیں۔ حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے وہ ان تمام امور کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن وہ اسکی اجازت قطعاً نہیں دیتا کہ الگ زبان بولنے یا الگ وضع قطع رکھنے کی بناء پر (جسے آجکل کلچر کہہ کر پکارا جاتا ہے) آپ ایک الگ قوم بن جائیں۔ قوم تو سارے مسلمانوں کی ایک ہی ہوگی۔ قرآن، اسلامی نظامِ زندگی میں تفرقہ کو شرک سے تعبیر کرتا

ہے۔ اور مسلمانوں کی عالمگیر قوم کے اندر مختلف قوموں کا تصور تفرقہ کی بدترین شکل ہے۔ یہ اسی تفرقہ کا نتیجہ ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن مشرقی بنگال میں بسنے والے غیر بنگالیوں کو، بنگالی مسلمانوں کا ہم قوم قرار نہیں دے رہا۔ حالانکہ، مغربی نظریۂ وطنیت کی رُو سے بھی، اس قسم کی تفریق کا کوئی جواز نہیں مل سکتا۔ اس نے اپنی ضد میں اسلام کے نظریۂ قومیت کو چھوڑا تو ساتھ ہی وطنیت کے نظریہ کو بھی خیرباد کہہ دیا اور خالص نسلی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کے نظریہ پر عمل پیرا ہو گیا۔ اب اس کی دیکھا دیکھی، مغربی پاکستان میں بھی یہی تصورات اُبھر رہے ہیں۔ ہندوستان میں رہنے والے پٹھانوں، بلوچیوں، سندھیوں، بنگالیوں نے، الگ الگ قومیت کا دعویٰ ابھی تک نہیں کیا لیکن مغربی پاکستان میں یہ دعاوی بھی اُبھرنے شروع ہو گئے ہیں۔ ہم ان حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جس متحدہ قومیت کے وہ ہندوستان میں علمبردار رہتے، کیا اُس میں قومیتوں کے اس تصور کی کہیں گنجائش تھی ــــ؟ اور اگر (خدا نکردہ) آج پاکستان اور ہندوستان پھر سے ایک ہو جائیں تو کیا آپ کو اس قسم کی قومیتوں کے دعاوی کو اُبھارنے کی اجازت ہو گی؟

باقی رہا یہ کہ مرکز کے پاس کون سے اختیارات ہوں گے اور صوبے کس حد تک خود مختار ہوں گے، تو قرآنِ کریم اس قسم کی انتظامی جزئیات خود متعین نہیں کرتا۔ وہ وحدتِ اُمت کا غیر متبدل اساسی اصول پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد، ہر وہ انتظامی پروگرام جو اس وحدت کو مستحکم رکھے گا اسلامی قرار پائے گا، جو اسے کمزور کرے گا غیر اسلامی ہو جائے گا۔ دنیا کے سارے مسلمان ایک قوم اور اُن کا ایک سیاسی مرکز۔ یہ ہے قرآن کے سیاسی نظام کا نقطۂ ماسکہ ــــ اس اصول کو عمل میں لائیے اور پھر دیکھئے کہ قرآنِ کریم نے جو مسلمانوں کے متعلق کہا تھا کہ یہ تمام اقوامِ عالم میں بلند ترین مقام پر فائز ہوں گے، یہ تصور کس طرح حقیقت بن کر سامنے نہیں آ جاتا؟ اگر ابتداً یہ نظام ساری دنیا میں قائم نہیں ہو سکتا تو کم از کم اس ایک چھوٹے سے خطّے ہی میں اسے قائم کر دیجئے۔ یہ تمام مشکلات ــــ لوٹ کھسوٹ، سلب و نہب، استحصال و استبداد ــــ جن کا ذکر صاحبِ مکتوب نے اپنے خط میں کیا ہے، یہ سب اس کا نتیجہ ہیں کہ ہم نے یہاں دین کے اشتراک کو معیارِ قومیت قرار نہیں دیا۔ ہم نے اپنے حریمِ قلب میں عہدِ جاہلیہ کے اُنہی بتوں ــــ نسل، زبان، وطن، وغیرہ کے امتیازات کے بتوں۔ کو علیٰ حالہٖ رکھا اور ہمارے سیاسی راہ نماؤں کی حماقتوں اور اربابِ اقتدار کی مفاد پرستیوں نے ان تفریقات کی گرہوں کو اور مضبوط کر دیا۔ مجیب نے اس سے فائدہ اُٹھانے میں پہل کی اور اپنی جداگانہ مملکت قائم کر لی۔ یہ کھلی ہوئی بغاوت تھی۔ اُسے کامیابی حاصل ہوئی تو اب مغربی پاکستان میں بھی ان خیالات نے دل کی گہرائیوں سے اچھل کر زبان تک آنا شروع کر دیا۔ ایک کامیاب بغاوت (یعنی وہ بغاوت جسے جائز تسلیم کر لیا جائے) بیسیوں بغاوتوں کے تصورات کو جنم دینے کا موجب بنتی ہے۔ مملکتیں اسی طرح تباہ ہوتی ہیں۔

آخر میں ہمارے جگر کی اُس ٹیس کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے جو ان حضرات کے طنز کے نشتروں کی پیدا کردہ ہے۔ طلوعِ اسلام کے اجراء کا تصور علامہ اقبالؒ نے عطا فرمایا۔ بدقسمتی سے وہ پنجابی تھے۔ اس کے دورِ اوّل کے بانی سید نذیر نیازی تھے، وہ بھی بدقسمتی سے پنجابی تھے۔ اس کا دورِ جدید شروع ہوا تو بدقسمتی سے اس

کے کار پرداز بھی پنجابی تھے۔ علامہ اقبالؒ کی فکر اور طلوع اسلام کا دورِ اوّل اور دورِ جدید، وحدتِ امّت کو دین کی اساس قرار دیتے ہیں اور مذہبی، سیاسی، لسانی، نسلی، وطنی غرضیکہ کسی قسم کے خودساختہ امتیاز کو قرآن کریم کی رُو سے شرک تصور کرتے ہیں۔ طلوع اسلام کے تمام فائل، شروع سے آخر تک، اس حقیقتِ کبریٰ کی زندہ شہادت ہیں، لیکن یہاں کیفیت یہ ہے کہ طلوع اسلام کی طرف سے جونہی کوئی ایسی بات پیش کی گئی جس سے کسی کے ذاتی یا گروہی مفاد پر زد پڑتی ہو، تو ہمیں فوراً "پنجابیت" کا طعنہ دے دیا گیا۔ آپ سوچئے کہ ہم اسکا جواب کیا دے سکتے ہیں؟ خط میں کہا گیا ہے کہ "پنجابی سرمایہ داروں کے ٹولہ نے وحدانی طرزِ حکومت کو قبول نہ کیا"۔ ہم صاحبِ مکتوب کی اطلاع کے لئے عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وحدانی طرزِ حکومت کا خیال سب سے پہلے طلوع اسلام نے پیش کیا تھا۔ اور جب اس نے دیکھا تھا کہ ملک اس کے لئے تیار نہیں تو اس نے آج سے بتیس سال پہلے بادلِ نخواستہ یہ تجویز پیش کی تھی کہ پاکستان کے ان دونوں بازوؤں میں خودمختار ریاستیں قائم کر کے، اُن میں کنفیڈریشن قائم کر دی جائے۔ لیکن اسے بھی کسی نے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔

ضمناً اس خط میں وحدانی طرزِ حکومت کو اسلامی طرز سے زیادہ قریب بتایا گیا ہے اور ون یونٹ کو غیر اسلامی حالانکہ، بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ خود ون یونٹ کے معنی بھی وحدانی حکومت کے ہیں۔ اور طلوع اسلام اس لئے اس کی حمایت کرتا ہے کہ یہ اسلامی نظام کے قریب تر ہے۔

آخر میں ہم پھر اسے دہرا دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے سامنے دو راستے کھلے ہوئے ہیں، ایک راستہ یہ کہ ہم اپنی موجودہ غیر اسلامی طرزِ زندگی کو علیٰ حالہٖ قائم اور جاری رکھنا چاہتے ہیں، اس صورت میں ہمیں مختلف مسائل کے سلسلے میں اسلام کو درمیان میں لانا ہی نہیں چاہیئے، اور دوسرا راستہ یہ کہ ہم اسلامی طرزِ زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہو گا کہ ہم اسلامی زندگی کے بنیادی اصول اور اقدار متعین طور پر اپنے سامنے رکھ لیں اور پھر یہ دیکھیں کہ ہم اپنے موجودہ حالات سے اس نہج زندگی تک بتدریج کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔ ان دو راہوں کے سوا جو راہ بھی اختیار کی جائے گی وہ منافقت کی راہ ہو گی، جسکا نتیجہ ضعف و انتشار اور ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ فیصلہ کرنے کی بات یہ ہے کہ ہم کونسا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں! اور اس میں ہمارا خطاب پاکستان کے ہر مسلمان سے ہے۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

کراچی میں — ہر اتوار صبح ۹ بجے (ریڈیو ٹیپ) بمقام دفتر بزم طلوع اسلام ۵۵ فردوس مارکیٹ (بالمقابل بس سٹاپ پہلی چورنگی ناظم آباد کراچی ۱۸) ٹیلیفون نمبر ۶۱۰۴۶۸

ملتان میں — ہر جمعہ بعد از نماز جمعہ (ریڈیو ٹیپ) بمقام دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ ملتان۔ ٹیلیفون نمبر ۲۰۷۱

سیالکوٹ میں — ہر اتوار صبح ۹ بجے (ریڈیو ٹیپ) بمقام چوہدری محمد دین ٹی سٹال، کرسچین ٹاؤن، بارہ پتھر سیالکوٹ (۲)

نقد و نظر

۱۔ راہ نجات

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (ایم۔ بی۔ بی۔ ایس) ایک عرصہ تک جماعت اسلامی سے وابستہ رہے۔ آج سے پندرہ سولہ سال قبل جب اس جماعت اکابرین کا ایک گروہ اس سے الگ ہوا ہے تو ان میں ڈاکٹر صاحب بھی شامل تھے۔ انہوں نے ماہنامہ میثاق میں "نقض غزل" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جن میں اس جماعت کے پس پردہ حالات کی نقاب کشائی کی گئی تھی لیکن معلوم نہیں کن مصالح کی بنا پر وہ سلسلہ آگے نہ چلا۔ اب انہوں نے قرآن مجید کی تبلیغ کے لئے ایک تحریک کا آغاز کیا ہے اور اپنے آپ کو اس مقصد کے لئے وقف کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنی پریکٹس وغیرہ بھی چھوڑ دی ہے۔ قرآنی تبلیغ کے لئے اپنے آپ کو اسطرح وقف کر دینا بڑا مبارک و مسعود اقدام ہے جس کے لئے ہم ڈاکٹر صاحب کو درخور تہنیت سمجھتے ہیں۔

یہ اقدام ہر چند موجب تبریک و تحسین ہے لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنے والا، قرآن کریم کی کس قسم کی تعلیم پیش کرتا ہے۔ اس کے اس ایثار کی قیمت اس معیار کے مطابق متعین ہو سکے گی، ورنہ دینی کاموں کے لئے اپنے آپ کو وقف کرنے والے تو سینکڑوں ہزاروں مل جائینگے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف مختلف مساجد اور مائکن میں قرآن کریم کا درس دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اگلے دنوں ایچیسن کالج میں ایک تقریر کی جس میں سورہ والعصر کی تفسیر بیان فرمائی۔ اس تقریر کو کالج کے شعبۂ اسلامیات کی طرف سے پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ وہ پمفلٹ اسوقت ہمارے زیر تبصرہ ہے۔ پمفلٹ میں کہا گیا ہے کہ یہ سورۃ "نجات کی شرطیں بیان کرتی ہے۔ یہ اس تفسیر کا عمودی نکتہ ہے اور اسی وجہ سے اس پمفلٹ کا نام بھی "راہ نجات" رکھا گیا ہے۔

لیکن نجات یا (SALVATION) کا نظریہ ہی غیر قرآنی ہے۔ اس نظریہ کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ انسان کسی مصیبت میں گرفتار ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کو نجات کہا جاتا ہے۔ عیسائیت میں عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ اپنے اولین ماں باپ کے گناہ کی آلائش ساتھ لیکر پیدا ہوتا ہے۔ اس آلائش سے چھٹکارا پالینا مقصود حیات ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ انسان، حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لائے۔ ہندوؤں کے شاستروں کی رو سے انسان اپنے

سابقہ جنم کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے نیا جنم لیتا ہے۔ اور اس سزا سے چھٹکارا حاصل کرنا (مکتی یا نجات پا لینا) مقصودِ زندگی ہے۔ اپنی کے ویدانت کی رو سے انسان کی آتما پرماتما سے الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں پھنس گئی ہے۔ اس کا اس دلدل سے نکل کر پھر اپنی اصل سے جا کر مل جانا نجات ہے۔ بدھ مت کے پیرو، ہر آرزو کو ایک نئی مصیبت کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔ ان مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا مقصدِ زندگی ہے اور یہ چیز ترکِ آرزو یا قربانی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ ویسے تو یہودی سب جنت میں جائیں گے لیکن سبت کے گناہ کی وجہ سے انہیں چند دنوں کے لئے جہنم میں جانا پڑیگا۔ جس سے ان کے اکابر انہیں نکالیں گے۔ اس کا نام نجات ہے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ نجات کا نظریہ ہر مذہب میں موجود ہے اور اس سے مقصد ہے کسی مصیبت یا عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنا۔ بادی النظر میں یہ حقیقت سمجھ میں آ جائیگی کہ نجات کا یہ نظریہ مہمل ہی نہیں بلکہ یکسر منفی لاحاصل کا مظہر ہے۔ اس کی رو سے تصور یہ سامنے آتا ہے کہ اس دنیا میں آنے سے پہلے انسان اچھا بھلا پاک و صاف تھا۔ خدا نے اسے دنیا میں بھیجا تو یہ مصیبتوں میں پھنس گیا۔ ان مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل کر لینا خواہ وہ اس دنیا میں ہو اور خواہ آخرت میں، انسانی زندگی کا منتہا ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ آپ صبح اٹھے تو بھلے چنگے تھے۔ اس کے بعد آپ کو حرارت ہو گئی۔ اس کے لئے آپ نے اور آپ کے متعلقین نے بھاگ دوڑ کی۔ ڈاکٹر کو بلایا۔ دوائیاں خریدیں، استعمال کیں۔ دو چار روز کے بعد آپ نے بخار سے نجات حاصل کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اس قدر تگ و دو کے بعد پھر ویسے کے ویسے ہو گئے جیسے اس صبح کو تھے (AS YOU WERE)۔ سوچئے کہ انسان کی پیدائش، تخلیقِ ارض و سماء، بعثتِ انبیاء کرام، ایمان و اعمالِ صالحہ کا ہمت طلب پروگرام، اس کے لئے جانگداز مشقتیں اور قربانیاں! کیا یہ سب اس لئے ہے کہ انسان جیسا پہلے تھا، پھر سے ویسا ہی ہو جائے! اس قسم کا پروگرام دینا بھی تمسخرِ خداوندی ہے۔

قرآن کی رو سے، انسان دنیا میں آتا ہے تو بعض مضمر صلاحیتیں لئے ہوئے۔ یہ صلاحیتیں اسے غیر نشوونما یافتہ شکل میں ملتی ہیں۔ ان کی نشوونما وحی کی راہ نمائی میں ممکن ہے۔ جب یہ نشوونما پا جائیں تو انسان کو اس دنیا میں بھی سرفرازیاں اور خوشگواریاں حاصل ہو جاتی ہیں اور وہ موت کے بعد زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل بھی ہو جاتا ہے۔ یہ کسی مصیبت سے چھٹکارا نہیں بلکہ بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ اس لئے قرآن کریم اسے فوز یا فلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ فوز کے معنی ACHIEVEMENTS ہیں۔ اور فلاح کے معنی شجرِ حیات کا برگ و بار لانا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم میں نجات کا لفظ خطرات سے محفوظ رکھے جانے کے لئے بھی آیا ہے۔ خطرات میں پھنس جانے کے بعد نجات حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ خطرات سے محفوظ رکھے جانے کے لئے۔ لیکن خطرات سے محفوظ رہنا بھی زندگی کا منفی پہلو ہے۔ مثبت پہلو نہیں۔ خطرات سے محفوظ رہنا مقصود بالذات نہیں۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ انسان امن و سکون سے زندگی کی کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔ مقصود "فوز و فلاح" ہے۔ نجات نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ سورۂ والعصر قرآن کریم کی "جامع ترین" سورۂ ہے۔ یہ ایک بیج کی مانند ہے۔ جس میں قرآن کا پورا درخت پنہاں ہے۔ یہ ایسی ہے کہ اگر قرآن میں اس کے سوا کچھ اور نازل نہ ہوتا تو بھی ہدایت کے لئے کافی تھی۔ یہ ہے اس سورت کی اہمیت، اور اس کا ماحصل جو کچھ بتایا گیا ہے (یعنی نجات) وہ قرآن

تصور کے خلاف ہے (اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق تفصیلی طور پر بہت کچھ الگ لکھا جا چکا ہے) اس اساسی مفہوم کے بعد اصل سورۃ کی طرف آیئے۔ ڈاکٹر صاحب نے حسبِ معمول والعصر کا ترجمہ کیا ہے "زمانے کی قسم ہے" اس قسم کی آیات کا یہ ترجمہ (قسم ہے) ہمارے ہاں صدیوں سے چلا آ رہا ہے اور کوئی اتنا نہیں سوچتا کہ اس سے خدا اور اس کی کتاب کے متعلق کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے۔ "قسم" سے مراد یہ ہوتی ہے کہ قسم کھانے والا اپنے بیان یا دعوے کی صداقت کے ثبوت کے لئے، اپنے سے کسی بڑے کو تائید میں پیش کرتا ہے۔ اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ خدا کو قسمیں کھانے کی کیا ضرورت ہے اور قسمیں بھی انجیر کی، زیتون کی، ستاروں کی، گھوڑوں کی!!

اصل یہ ہے کہ ان آیات میں (واؤ) شہادت یا گواہی کے لئے آتا ہے۔ والعصر کے معنی یہ ہیں کہ زمانہ (یا انسان کی تاریخ) اس حقیقت پر شاہد ہے کہ...... خود ڈاکٹر صاحب نے بھی آگے جا کر کہا ہے کہ قسم سے مراد شہادت ہوتی ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر ترجمہ میں "زمانہ کی قسم" کہہ کر خواہ مخواہ ذہنوں میں الجھاؤ کیوں پیدا کیا جائے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب، لفظ عصر کی تشریح میں، عصر اور دھر میں فرق کرتے ہوئے زمان (TIME) کی فلسفیانہ بحث میں الجھ گئے ہیں۔ زمان (TIME) کا فلسفہ اس قدر مشکل اور دقیق ہے کہ آج بھی گنتی کے چند فلاسفر اسے کما حقہ سمجھ سکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ عربی زبان بڑی وسیع المعانی ہے لیکن نزولِ قرآن کے زمانے میں اس قسم کی فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ نکات آفرینیوں نے ان کے ہاں بار ہی نہیں پایا تھا، اس لئے ان کی زبان میں یہ تصورات آ سکے ہی نہیں تھے۔ ہمیں تسلیم ہے کہ قرآنی الفاظ اور آیات کا مفہوم عصرِ حاضر کے علوم کی روشنی میں سمجھنا اور سمجھانا چاہیئے لیکن ایسا کرتے میں اس امر کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ہم اپنی فکر کی رو سے کوئی ایسی بات قرآن کی طرف منسوب نہ کر دیں جس سے قرآن پر کوئی اعتراض وارد ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ قرآن کریم میں عصر اور دھر دونوں الفاظ آئے ہیں۔ پھر انہوں نے کہا ہے کہ فلسفہ کی زبان میں یوں کہیئے کہ دھر (PURE DURATION) یا (ABSOLUTE TIME) کو کہیں گے اور عصر زمانِ مسلسل (SERIAL TIME) کو۔ دھر کے اس مفہوم کے پیشِ نظر، فلسفہ زمان کا ایک طالب العلم بھی یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ جب دھر کے معنی (PURE DURATION) کے ہیں تو قرآن نے حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (زمانے) کیسے کہہ دیا؟ حِیْنٌ (A PERIOD; OF, A WHILE) تو زمان کے مقید حصے کو کہتے ہیں" اور (PURE DURATION) میں اس کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ معترض کہہ سکتا ہے کہ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآن بھیجنے والے کو (معاذ اللہ) اتنا بھی علم نہیں تھا کہ (PURE DURATION) میں حِیْنٌ نہیں ہوتے؟

آپ نے غور فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی طرف سے تو ایک فلسفیانہ نکتہ پیدا کیا لیکن اس سے قرآن پر کتنا بڑا اعتراض وارد ہو گیا!

اس کے بعد اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ: "پوری نوعِ انسان تباہی اور ہلاکت و بربادی سے دوچار ہونے والی ہے"۔ یہ مفہوم بھی صحیح نہیں۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر "پوری نوعِ انسان" تباہی اور بربادی سے دوچار ہونے والا ہے تو پھر اِلَّا الَّذِیْنَ

انفسُوا ...... کے استشہاد کی گنجائش کیسے نکل سکے گی؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں "الانسان" کے متعلق کچھ کہا گیا ہے۔ تو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس سے کیا مراد ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ انسان بڑا جھگڑالو واقعہ ہوا ہے۔ ([illegible]) ظالم اور جاہل ہے (۳۳/۷۲) بے صبرا ہے ([illegible]) ناشکرا ہے ([illegible]) خیر کی جگہ شر کو آوازیں دے دے کر بلاتا ہے ([illegible]) جلد باز ہے ([illegible]) وغیرہ وغیرہ۔ اس پر کہنے والے کہتے ہیں کہ اگر انسان ایسا ہی ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ عیسائیت کا یہ عقیدہ مبنی بر حقیقت ہے کہ ہر انسانی بچہ گنہگار پیدا ہوتا ہے اور اس کا منطقی نتیجہ بھی صحیح ہے کہ جب انسان کی فطرت ایسی ہے تو فطرت ناقابل تغیر ہوتی ہے اس لئے انسان کے بس کی بات ہی نہیں کہ وہ اپنی سعی و کاوش سے نیک بن جائے۔ اس کی نجات کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ وہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان لے آئے۔ ہمارے ہاں، ان اعتراضات کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ یہی بات اب ڈاکٹر صاحب نے کہدی ہے کہ "ساری نوعِ انسانی تباہی اور بربادی سے دوچار ہونے والا ہے"۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ انسان بھی حیوانات ہی کی ایک بڑھی ہوئی شکل کا نام ہے۔ اس لئے اس میں طبعی زندگی کے تقاضے حیوانات کی طرح موجود ہیں۔ لیکن انسان اور دیگر حیوانات میں بنیادی فرق ہے۔ ایک تو یہ کہ حیوانات پر فطرت نے خود کنٹرول عائد کر رکھا ہے اس لئے وہ اپنی زندگی کے تقاضوں کو اس کے کنٹرول کے تابع پورا کرتے ہیں۔ [آپ نے دیکھا نہیں کہ ایک بیل، گایوں کے گلہ میں دن رات رہتا ہے اور اس میں جنسی قوت بھی ہوتی ہے لیکن وہ اس کی تسکین کے لئے کسی گائے کی طرف رجوع نہیں کرتا تاوقتیکہ اسے فطرت کی طرف سے اس کی اجازت نہ مل جائے۔ (اسے MATING SEASON کہا جاتا ہے۔] لیکن انسان پر فطرت نے اپنا کنٹرول نہیں رکھا۔ اسے صاحبِ اختیار پیدا کیا گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ انسانوں نے مل جل کر تمدنی زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ اگر کسی نوع نے تمدنی زندگی بسر کرنی ہو اور اس کے طبعی تقاضوں کی تسکین کے لئے فطرت کی طرف سے کنٹرول کوئی نہ ہو تو اس کا نتیجہ "فساد انگیزیوں، خونریزیوں" کے سوا کیا ہو گا؟ ([illegible]) وحی وہ حدود متعین کرتی ہے جن کے اندر رہتے ہوئے انسان کو اپنی طبعی زندگی کے تقاضوں کی تسکین کرنی چاہیئے۔

جب قرآن کہتا ہے کہ انسان ایسا ہے اور انسان ویسا ہے" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر انسان کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو وہ اس قسم کا حیوان ہو گا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کے طبعی تقاضوں پر کنٹرول عائد کیا جائے تاکہ وہ ایسا نہ بن جائے۔ اسے وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہی اس لئے ہے۔ اگر وہ وحی کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے ان تقاضوں کو پورا کرے تو اس کا نتیجہ امن و سکون اور زندگی کی خوش حالیاں اور سرفرازیاں ہوتا ہے لیکن اگر وہ ان حدود کو فراموش کر دے یا ان سے سرکشی برتے تو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ وہ اپنے اس دعوے کی صداقت کے ثبوت میں اممِ سابقہ کی سرگذشتوں (انسانی تاریخ) کو بطور شہادت پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم خود دیکھ لو کہ فلاں قوم نے وحی کے مطابق زندگی بسر کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا اور جس قوم نے سرکشی اختیار کی اس کا انجام کیا ہوا۔

اور اس حقیقت کو اس نے سورۃ العصر کی نہایت مختصر آیات میں سمیٹ کر بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے کہ:

نوعِ انسان کی تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان نے جب بھی وحی سے آزاد ہو کر زندگی بسر کی

تو اس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوا۔ لیکن جس قوم نے وحی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے زندگی بسر کی
اس کا انجام ایسا نہیں ہوا۔ وہ کامیاب و شادکام رہی۔

یہ ہے قرآن کا دعویٰ۔ اب قرآنی فکر کی تبلیغ کرنے والے کا فریضہ ہے کہ وہ انسانی تاریخ سے قرآن کے اس دعوے کی صداقت کی شہادت پیش کرے۔ اسے کہا جائے گا "درسِ قرآن"

ڈاکٹر صاحب کے حسنِ نیت، خلوصِ مقصد اور قرآنی تعلیم کی تبلیغ کے لئے ان کے جذبۂ ایثار کی بناء پر ہمارے دل میں ان کا بڑا احترام ہے۔ اسی احترام کی بناء پر ہم ان کی خدمت میں یہ مشورہ پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کی تبلیغ صحیح نتائج پیدا کرے، تو وہ پہلے کچھ مزید مدت کے لئے "طالب العلمانہ" روش اختیار کریں۔ پہلے اپنے ذہن کو سابقہ تصورات و تاثرات سے پاک اور صاف کریں اور پھر قرآنی حقائق کا اور زیادہ غور و تدبر سے مطالعہ کریں؛ اور تبلیغی میدان میں اس وقت اتریں جب ان کی فکر میں پختگی پیدا ہو جائے۔ وہ (بالعموم) تعلیم یافتہ طبقہ میں اپنے درس دیتے ہیں؛ اور ان کے سامعین بھی یہ سمجھ کر ان کا درس سننے آتے ہیں کہ وہ کوئی "کٹھ مُلّا" نہیں، تعلیم یافتہ مبلغِ قرآن ہیں۔ اس سے ان کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ناپختگیٔ فکر کی بناء پر قرآنی حقائق پیش کرنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جب (از اں بعد) وہ اپنی پختگیٔ فکر کے زمانے کے مطابق درس کرتا ہے تو جتنی محنت اس نے ان (غلط) نقوش کے مرتسم کرنے میں صرف کی تھی، اس سے کہیں زیادہ محنت ان کے مٹانے میں صرف کرنی پڑتی ہے اور پھر بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ مختلف ذہنوں سے وہ تمام نقوش مٹا دیئے گئے ہیں۔ نہ معلوم وہ نقوش کہاں کہاں تک پہنچ چکے ہوتے ہیں، اور کن کن گہرائیوں تک۔ تبلیغِ قرآن کا راستہ "پل صراط" ہے — بال سے بھی زیادہ باریک اور تلوار سے بھی زیادہ تیز اور نیچے شعلہ فشاں جہنم!

زیرِ نظر پمفلٹ نہایت خوبصورت چھپا ہے اور شعبۂ اسلامیات، ایچی سن کالج لاہور سے (غالباً) بلا قیمت مل سکتا ہے (کیونکہ اس پر کوئی قیمت درج نہیں)۔ ہم ایچی سن کالج کے اربابِ بست و کشاد کو بھی مستحقِ مبارک باد سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ہاں کے طلباء کے لئے قرآنی درس کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

۲- اللہ کے احکام

اس کتابچہ میں، حافظ نذر احمد صاحب نے بچوں کیلئے اسّی قرآنی احکام (چالیس اوامر اور چالیس نواہی) یکجا پیش کئے ہیں۔ کتابچہ، مسلم اکادمی، ۱۸/۲۹ محمد نگر، علامہ اقبال روڈ، لاہور کی طرف سے شائع کیا گیا ہے، اور دو روپے میں انہی سے مل سکتا ہے۔ بچوں میں قرآنی تعلیم کے عام کرنے کی ہر صحیح کوشش مستحقِ تحسین و تبریک ہے۔ انکی ابتدائی زندگی کی بنیادیں، قرآنی تصورات پر استوار ہو جائیں، تو ان کی مستقبل کی زندگی کے صحیح خطوط پر متشکل ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس اعتبار سے حافظ صاحب کی یہ کوشش مبارک و مسعود ہے، لیکن بچوں کے لئے دینی لٹریچر مرتب کرنا بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ مرتب کرنے والے کو بچے کی ذہنی سطح پر اترنا پڑتا ہے۔ زیرِ نظر کتابچہ میں بیشتر احکام ایسے ہیں جنہیں بچے بآسانی سمجھ سکتے ہیں لیکن بعض احکام ایسے بھی درج ہیں جن کا وہ صحیح مفہوم یا ادراک نہیں کر سکتے اور ان کا غلط تصور زندگی پر بڑا نقصان رساں اثر مرتب کرتا ہے۔ مثلاً

اس میں کہا گیا ہے) اللہ سے مانگو۔ اللہ سے ڈرو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔ اللہ کا شکر ادا کرو۔ انشاء اللہ کہو۔ یا شرک نہ کرو۔ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ وغیرہ بچے ان کے صحیح مفہوم کا ادراک نہیں کر سکتے اور مروجہ مفہوم بڑی غلط فہمیوں کا موجب بنتا ہے۔ بچوں کی کتابوں میں اس قسم کے احکام درج نہیں کرنے چاہئیں۔ انہیں ٹھوس احکام سکھانے چاہئیں۔ جھوٹ نہ بولو۔ وعدہ خلافی نہ کرو۔ وغیرہ۔

علاوہ بریں اس میں بعض امور تنقیح طلب بھی ہیں۔ مثلاً ایک عنوان ہے۔ "حلال کو حرام نہ بناؤ"۔ اس میں اول تو یہ نہیں بتایا گیا کہ حلال کو حرام کس طرح بنایا جاتا ہے جس سے روکا گیا ہے۔ دوسرے اس میں کہا گیا ہے۔

حرام چیزوں میں سرفہرست ہیں: مردار جانور۔ خون۔ سور کا گوشت اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے (البقرہ ۲:۱۷۳)

قرآن کریم میں وَ مَا اُھِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ہے یعنی جس چیز کو بھی خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف منسوب کیا جائے وہ حرام ہو جاتی ہے اسے جانور تک محدود کر دینا منشائے قرآنی کے خلاف ہے۔ اس کے بعد کتابچہ میں لکھا گیا ہے۔

اسی طرح کچھ اور جانور حرام ہیں جن کا ذکر واضح طور پر کلام اللہ میں موجود ہے۔ (صفحہ ۹)

اوّل تو سوال یہ ہے کہ جب کلام اللہ میں اور حرام جانوروں کا ذکر بھی واضح طور پر موجود ہے تو آپ نے حرام کی فہرست کو انہی چار چیزوں تک محدود کیوں رکھا۔ انہیں بھی درج کتاب کیوں نہ کیا؟

دوسرے یہ کہ قرآن کریم میں رسول اکرمؐ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا ہے کہ

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا ... اِلَّآ اَنْ یَّكُوْنَ مَیْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِیْرٍ .... اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ (۶/۱۴۶)

ان سے کہہ دو کہ میری طرف جو کچھ وحی کیا گیا ہے اس میں میں ان چار چیزوں کے علاوہ کسی چیز کو حرام نہیں پاتا۔ یعنی مردہ۔ بہتا ہوا لہو۔ خنزیر کا گوشت اور ہر وہ شے جسے خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا گیا ہو۔

یعنی رسول اللہ تو فرماتے ہیں کہ میں کلام اللہ میں ان چار چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز کو حرام نہیں پاتا اور حافظ نذر احمد صاحب فرماتے ہیں کہ "اسی طرح کچھ اور جانور حرام ہیں جن کا ذکر واضح طور پر کلام اللہ میں موجود ہے"۔ حیرت ہے کہ جن حرام جانوروں کا ذکر (بقول حافظ صاحب) کلام اللہ میں واضح طور پر موجود ہے، رسول اللہ انہیں قرآن کریم میں کہیں نہ پا سکے ——— معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

اور اگر کہا جائے کہ اس سے مراد ہیں المنخنقة - و المتردية وغیرہ (یعنی جو گلا گھٹ کر مرا ہو اور جو اوپر سے گر کر مرا ہو وغیرہ) جن کا ذکر سورہ مائدہ کی آیت ۳ میں آتا ہے تو وہ المیتة (مردار) اور مَا اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ کی قرآنی تشریح ہے نہ کہ حرام جانوروں کی مزید فہرست۔ ویسے تو دین کے ہر معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے لیکن حرام و حلال کے سلسلہ میں اس احتیاط کی شدت اور اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے — اور جو لٹریچر بچوں کے لئے تیار کیا جائے اس میں مزید تر۔

ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات — اور ان کے علاوہ، لاہور سے کوئی بھی کتاب منگانے کیلئے
مکتبہ دین و دانش، چوک اردو بازار۔ لاہور

سرمایہ داروں کا انجام

پرویز

[پرویز صاحب کے مقالات 'ظلم کا انجام' اور 'مفسدین کا انجام' طلوعِ اسلام بابت جولائی اور اگست ۱۹۷۳ء میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ اس سلسلہ کی تیسری کڑی درج ذیل ہے۔ طلوعِ اسلام]

"سرمایہ داروں" کے لئے قرآن کریم میں دو اصطلاحات عام طور پر آتی ہیں۔

(۱) اَلْمَلَأُ ــــ (مَلَأَ ــــ یَمْلَأُ ــــ مَلْأً) کے بنیادی معنے ہیں، کسی چیز کو بھر دینا ــــ اس اعتبار سے اَلْمَلَأُ ان لوگوں کو کہتے ہیں جن کے گھر ضروریاتِ زندگی کی اشیاء سے بھرے ہوئے ہوں۔ جنہیں سامانِ زیست بڑی فراوانی سے حاصل ہو۔ چونکہ غیر خداوندی نظام میں عزت اور ریاست کا معیار، دولت ہوتی ہے۔ اس لئے یہی لوگ قبیلہ یا قوم کے سردار بھی ہوتے تھے اس لئے تبعاً یہ لفظ (اَلْمَلَأُ) سردارانِ قوم کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ لیکن اس سے بنیادی طور پر مراد سرمایہ دار طبقہ ہی تھا۔

(۲) مُتْرَفِيْنَ ــــ وہ لوگ جو عیش و آرام کی زندگی گذار رہے ہوں۔ ایسے خوشحال لوگ جن کے پاس کثرت سے دولت ہو، اور اس بنا پر وہ بڑے خود سر ہو جائیں۔ قرآن کریم نے مُتْرَفِيْنَ کی وضاحت خود ہی کر دی ہے جہاں کہا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ قَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّ مَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ - (۳۴/۳۵) جو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس بڑی کثرت سے دولت ہے اور ہمارا قبیلہ اور جتھہ بھی بہت بڑا ہے۔ ہم جو جی میں آئے کریں۔ ہمیں کون ہاتھ لگا سکتا ہے؟

قرآن کریم بتاتا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ دینِ خداوندی کی مخالفت کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ آسمانی دعوتِ انقلاب کے داعیِ اوّل حضرت نوحؑ کے تذکرہ جلیلہ کے ضمن میں کہتا ہے۔

ہم نے نوحؑ کو اس کی قوم کی طرف پیغامبر بنا کر بھیجا۔ اس نے اُن سے کہا کہ تم قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرو۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی قوت نہیں جس کی محکومی اختیار کی جائے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا (اور اپنی موجودہ روش پہ اڑے رہے) تو مجھے نظر

آتا ہے کہ تم پر سخت تباہی آجائے گی۔ (۷/۵۹)

آپ نے پیغام دیکھ لیا۔ یہ پیغام ساری قوم کے لئے تھا۔ لیکن قوم میں سے بھڑک کر کون سا طبقہ اٹھا؟ ——— سنئے!

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۔ (۷/۶۰)

اس قوم کے دولت مند سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ تم عجیب اُلٹے راستے پر چل رہے ہو۔ (ہمیں اس روش پر چلنے سے اسقدر مال و دولت حاصل ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ اسی

سے ہم پر تباہی آجائے گی)

سورۃ ھود میں اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے۔ جہاں کہا ہے کہ۔

اس پر قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے کہا کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ تم ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ (اس لئے ہم کیسے مان لیں کہ تم خدا کے رسول ہو) باقی رہے یہ لوگ جو تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں تو ان کی حیثیت ہی کیا ہے؟ یہ ہم میں سے نچلے درجے کے لوگ ہیں اور یہ صاف دکھائی دے رہا ہے کہ انہوں نے تمہارا مسلک کسی عقل و فکر کی رُو سے اختیار نہیں کیا۔ یونہی بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں۔ ہمیں تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جس میں تمہیں ہمارے مقابلہ میں کوئی برتری حاصل ہو ——— لہٰذا ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تم اپنے اس دعوے میں جھوٹے ہو۔ (۱۱/۲۷)

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ قوم کے غریب اور کمزور طبقہ نے اس دعوت پر لبیک کہا۔ اور دولت مند اور طاقت ور طبقہ نے اسکی مخالفت کی۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اس دولت مند طبقہ کی طرف سے یہ مطالبہ پیش کیا گیا کہ تم ان غریب اور نادار لوگوں کو دھتکار کر نکال دو تو پھر ہم تمہاری بات سننے کے لئے آمادہ ہو سکیں گے۔ اس پر حضرت نوحؑ نے کہا کہ۔

تم اس پر غور کرو کہ میں جو کچھ تمہاری بھلائی کیلئے کرنا چاہتا ہوں، اس کے معاوضہ میں تم سے کوئی مال و دولت نہیں مانگتا۔ لیکن میں یہ نہیں کر سکتا کہ جو لوگ اس نظام کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں، انہیں اس لئے نکال باہر کروں کہ وہ غریب و نادار ہیں اور اس لئے تم انہیں ذلیل سمجھتے ہو ——— میں اگر تمہاری خاطر ان لوگوں کو دھتکار دوں، تو اس سے تم تو بیشک خوش ہو جاؤ گے، لیکن ذرا سوچو کہ قانونِ خداوندی کی رُو سے اس جُرم کی جو سزا مجھ پر وارد ہو جائے گی اس سے مجھے کون بچا سکے گا؟ .... تم جو یہ سمجھتے ہو کہ یہ لوگ جنہیں تم اپنے معیار کے مطابق ذلیل اور حقیر خیال کرتے ہو، خدا کی نظروں میں بھی ذلیل و حقیر ہیں، اور انہیں اس کے ہاں سے کوئی خوشگواری کا سامان نہیں مل سکتا، یہ غلط ہے قانونِ خداوندی کی رُو سے معیارِ عزت و تکریم اور استحقاقِ خیر و برکت انسان کے جوہر

ذاتی ہیں۔ اس کی نگاہ کسی کے مال و دولت پر نہیں، بلکہ انسان کے دل پر ہوتی ہے۔ اگر میں تمہاری بات مان لوں، تو میں بھی تمہارے ہی جیسا ظالم ہو جاؤں۔ (۱۱/۲۹-۳۱)

آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کا جواب کیا دیا؟ وہی، جو ہر ایسا شخص دیا کرتا ہے جو دولت و قوت کے نشہ میں بدمست ہو، انہوں نے کہا۔

اے نوحؑ! ہم نے تم سے یونہی ذرا سی بات کی تھی اور تم ہو کہ آگے ہی آگے بڑھتے چلے جا رہے ہو۔ ہم تمہاری کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں۔ تم جس تباہی کی دھمکی دے رہے ہو، اسے لے آؤ ___ ہم دیکھیں کہ وہ ہمارا کیا بگاڑ لیتی ہے۔ (۱۱/۳۲)

سورۃ الشعراء میں ہے کہ ان امرائے قوم نے کہا کہ

اے نوحؑ! تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا ہم تمہیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیں اور اس طرح تمہاری اس جماعت میں شامل ہو جائیں۔ جس میں سوسائٹی کے وہ لوگ شامل ہیں جو نہایت پست اور ذلیل ہیں اور ادنیٰ درجے کے کام کاج کرتے ہیں (وہ مزدور اور محنت کش ہیں۔ کیا ہم اس جماعت میں شامل ہو کر ان لوگوں کو اپنا ہمسر بنا لیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟) (۲۶/۱۱۱)

اس پر حضرت نوحؑ نے کہا کہ مجھے اس سے غرض نہیں کہ میں معلوم کروں کہ یہ لوگ کیا کام کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ لوگ صداقت کو کس قدر تسلیم کرتے ہیں اور اس نظام کے قیام کے لئے کیا کرتے ہیں جسے میں پیش کرتا ہوں۔ یہی ہمارے ہاں قدر و قیمت کے پیمانے ہیں۔ میرے نزدیک یہ غریب و نادار لوگ جو اس نظام کے قیام کے لئے میرے رفیق کار بنے ہیں، ان سردارانِ قوم سے کہیں زیادہ واجب الاحترام ہیں، جو اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ (۲۶/۱۱۱-۱۱۴)

سورۃ المومنون میں ہے کہ ان رؤسائے قوم نے، اپنے طبقہ کے دیگر افراد سے کہا کہ یاد رکھو! اس شخص سے بڑا محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ تو ہم پر بالادستی (SUPERIORITY) حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنا نظام مسلط کر دے۔ اس کا (معاذ اللہ) دماغ چل گیا ہے۔ یہ پاگل ہو گیا ہے جو کہتا ہے کہ امیر و غریب سب ایک جیسے ہیں۔ تم چند دنوں تک انتظار کرو۔ اس کی یہ تحریک خود بخود ناکام ہو جائے گی۔ (۲۳/۲۴)

لیکن، آخر الامر ہوا یہ کہ انہی ناداروں اور غریبوں کی جماعت محفوظ رہی، اور وہ جو سامانِ زیست کی فراوانیوں سے اس قدر بدمست ہو رہے تھے غرق ہو گئے۔

حق و باطل کی کشمکش کی اس پہلی کڑی کو بیان کرنے کے بعد، قرآن کریم کہتا ہے کہ:

اس سرگذشت میں تمہارے لئے، ہمارے قانونِ مکافات کی ہمہ گیری کی نشانیاں ہیں۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہم غلط نظام کو کس طرح الٹا کر رکھ دیا کرتے ہیں ___ (۵۴/۱۵)

قوم نوحؑ کے بعد ہمارے سامنے قوم عادؑ کا تذکرہ آتا ہے جس کی طرف حضرت ہودؑ مبعوث ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی قوم کے سامنے اسی انقلاب آفرین نظامِ زندگی (دین) کو پیش کیا جسے حضرت نوحؑ نے پیش کیا تھا۔ اس کے جواب میں قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ - اس قوم کے بڑے بڑے سرغنوں نے جنہیں مال و دولت کی فراوانی حاصل تھی، اور جو اس دعوت کی مخالفت کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کہا کہ۔

ہمیں تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم عقل و ہوش کھو بیٹھے ہو تم جو کہتے ہو کہ ہماری روش ہمیں تباہیوں کی طرف لے جا رہی ہے' یہ سب جھوٹ ہے۔ (۷/۶۶) نیز (۲۳/۲۴)

اس قوم کو رزق کی کس قدر فراوانیاں حاصل تھیں اور اس کے بل بوتے پر انہوں نے خلقِ خدا پر کس طرح گوشۂ عافیت تنگ کر رکھا تھا، اس کے ضمن میں قرآن کریم میں ہے کہ

حضرت ہودؑ نے ان سے کہا کہ ذرا دیکھو کہ تمہیں اس وقت سامانِ زیست کس قدر فراواں حاصل ہے۔ مال و مویشی کی کثرت، افراد قبیلہ کی بہتات، لہلہاتے باغ، اُن کی سیرابی کے لئے رواں چشمے (یہ سب خدائی عطا کردہ ذرائع رزق ہیں جسے اس نے تمام انسانوں کی پرورش کے لئے پیدا کیا تھا، لیکن تم اسے کمزوروں اور ناداروں پر ظلم کرنے کے لئے استعمال کرتے ہو۔ تمہاری حالت یہ ہے کہ تم اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے اونچی اونچی پہاڑیوں پر اس قسم کے میموریل بناتے ہو جنکا کوئی معرف نہیں۔ ان سے بھلا نوعِ انسانی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اور تم بڑے بڑے سازوسامان (اور اسلحہ وغیرہ) بناتے ہو۔ اس لئے نہیں کہ اس سے ظلم کی روک تھام کرو بلکہ اس لئے کہ کمزوروں پر تمہارے آہنی پنجے کی گرفت ڈھیلی نہ ہونے پائے اور تمہارا غلبہ و تسلط ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔ تم اس روش کو چھوڑ دو اور قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ (۲۶/۱۲۵-۱۲۸)

اس طبقہ کی طرف سے اس کا ردِ عمل کیا تھا؟ قرآن بتاتا ہے کہ

(انہوں نے یہ سب کچھ سُنا اور نہایت طنز اور حقارت سے کہا کہ آپ کے اس وعظ کا شکریہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں) ہمارے لئے تمہارا وعظ و نصیحت کرنا، نہ کرنا یکساں ہے (خدا، اور اس کا قانونِ مکافات، تباہیوں اور بربادیوں کا عذاب، جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ یہ سب) اگلے زمانے کے لوگوں کے من گھڑت افسانے ہیں۔ ہم پر کوئی تباہی نہیں آ سکتی۔ (۲۶/۱۳۶-۱۳۹)

وہ کوئی جاہل اور گنوار قوم نہیں تھی۔ ان کے پاس سننے کے لئے کان، دیکھنے کے لئے آنکھیں، اور سمجھنے سوچنے کے لئے دل و دماغ تھے لیکن جب انہوں نے قوانینِ خداوندی کی اس طرح مخالفت کی تو ان کی سماعت و بصارت و قلب ان کے کسی کام نہ آئے۔ ان کا علم و عقل انہیں اس تباہی سے نہ بچا سکا۔ جس کا

وہ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ (۱۱/۳۸)

حضرت ہودؑ نے ان سے کہا تھا کہ "اگر تم نے اس غلط روش کو نہ چھوڑا، تو تمہاری جگہ ایک اور قوم آجائے گی جن کا نظام تمہارے نظام کی ضد ہوگا" (۱۱/۵۷) یہ ہے خدا کے قانونِ مکافات کی رو سے، قوموں کے استبدال و استخلاف (SUCCESSION AND SUBSTITUTION) کا اصول جس کی رو سے وہ قوم جو غلط نظامِ حیات کی حامل ہو، تباہ و برباد ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ قوم لے لیتی ہے جو صحیح نظام کی حامل ہو۔

قوم عادؔ کے بعد ہمارے سامنے قوم ثمودؔ آتی ہے جس کی طرف حضرت صالحؑ دعوتِ انقلاب لے کر آئے تھے وہ زمانہ گلہ بانی کا تھا۔ معیشت کا مدار مویشی تھے۔ اور ان مویشیوں کی زندگی کا مدار چراگاہوں اور پانی کے چشموں پر تھا۔ اس قوم کے بالادست طبقہ نے ان ذرائع پرورش کو اپنی ملکیت بنا لے رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں کے جانوروں کو ان میں گھسنے نہیں دیا جاتا تھا۔ ان کی پانی کی باری ہی نہیں آتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ خاندانی اعتبار سے حضرت صالحؑ کا تعلق بھی اسی طبقہ سے تھا۔ لیکن انہوں نے ان کی اس باطل روش کے خلاف اعلانِ انقلاب کیا تو انہوں نے کہا کہ

يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ (۱۱/۶۲)

اے صالحؑ! ہماری تو تمہارے ساتھ بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ تم تو ہماری امیدوں کے مرکز تھے۔ تم یہ کیا کرنے لگ گئے؟

یہ کہنے والے کون تھے؟ وہی اَلْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ (۷/۷۵) اس کی قوم کا وہ دولت مند طبقہ جس نے دھاندلی مچا رکھی تھی۔

اور حضرت ہودؑ نے ان سے کیا کہا تھا جس پر یہ ان کی طرف سے اس قدر مایوس ہو کر بگڑ بیٹھے تھے؟ — انہوں نے کہا تھا کہ

دیکھو! خدا نے تمہیں اس ملک میں کس قدر تمکن عطا کیا ہے۔ تم میدانوں میں محلات تعمیر کرتے ہو۔ پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں مکانات بناتے ہو۔ تم خدا کی ان نعمتوں کو اپنے پیشِ نظر رکھو۔ اور ملک میں فساد مت برپا کرو۔ (۷/۷۴)

پھر انہوں نے کہا کہ

ذرا سوچو کہ اگر تم نے اپنا معاشی نظام اسی قسم کا رکھا جس سے معاشرہ میں اس قدر ناہمواریاں پیدا ہو جائیں، تو کیا یہ آسائشیں اور فارغ البالیاں اسی طرح رہنے دی جائیں گی۔ کیا تم ان لہلہاتے باغات اور چشموں میں، ان زرخیز زمینوں میں، ان نخلستانوں میں جہاں درختوں پر پھلوں کے نرم اور خوشگوار خوشے تر بتر لٹک رہے ہیں۔ اور ان قلعہ نما محلوں میں جنہیں تم پہاڑوں کو تراش کر بڑی صنعت کاری سے بناتے ہو اور پھر اتراتے ہو

کہ یہاں تمہارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا ___ اسی طرح رہو گے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس غلط معاشی نظام کے باوجود یہ تمام خوشحالیاں علیٰ حالہٖ قائم رہینگی! (۲۶/۱۴۱-۱۵۲)

اس پر انہوں نے وہی حربہ اختیار کیا جو ابلیسی سیاست کے علمبردار اختیار کیا کرتے ہیں۔ یعنی انہوں نے حضرت صالحؑ سے تو کچھ نہ کہا، کیوں کہ ان کا خاندان بڑا تھا۔ لیکن ان کے متبعین کو جو غریبوں، اور کمزوروں پر مشتمل تھے، دھمکانا شروع کر دیا۔

اس پر اس قوم کے سرکش اکابرین نے، جنہیں مال و دولت کی فراوانی نے بدمست کر رکھا تھا، جماعتِ مومنین سے کہا ___ اور یہ وہ لوگ تھے جنہیں وہ اکابرین، ان کے افلاس کی وجہ سے بہت کمزور اور حقیر سمجھتے تھے ___ کہ کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ صالحؑ خدا کا رسول ہے؟ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم اسے ایسا تسلیم نہیں کرتے ___ (اس لئے تم خود سمجھ لو کہ جس روش کو ہم صحیح نہیں سمجھتے اس پر چلنے سے تمہارا کیا حشر ہو گا۔) (۷/۷۵-۷۶)

جب یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا۔ تو انہوں نے حضرت صالحؑ سے مصالحت کی کوشش کی۔ اور ان سے پوچھا کہ آپ چاہتے کیا ہیں؟ انہوں نے کہا کہ میں اس کے سوا اور کیا چاہتا ہوں کہ خدا نے جو رزق تمام انسانوں کی پرورش کے لئے پیدا کیا ہے، اسے تمام انسانوں کے لئے کھلا رکھا جائے۔ ہر ایک کے مویشی چراگاہوں میں چریں اور اپنی باری چشموں سے پانی پئیں۔ اس پر وہ راضی ہو گئے تو حضرت صالحؑ نے کہا۔ کہ مجھے اس کا عملی ثبوت ملنا چاہیئے کہ تم اس معاہدہ پر کاربند رہتے ہو۔ اس وقت تمہاری حالت یہ ہے کہ تم نے خدا کی زمین پر لکیریں کھینچ کر ___ یہ میری اور یہ تیری ___ کی تفریق پیدا کر رکھی ہے۔ اور پھر "میری زمین میں میرے مویشی چر سکتے ہیں اور تیری زمین تیرے" حالانکہ نہ زمین میری اور تیری ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس مقصد کے لئے میرے اور تیرے مویشیوں کی تفریق ___ یہ ایک اونٹنی ہے جسے یوں سمجھو کہ یہ نہ میری ہے، نہ تیری ___ اور اسے میں چراگاہ میں چھوڑتا ہوں، جو نہ میری ہے نہ تیری۔

هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ ___ تَأْكُلْ فِىٓ اَرْضِ اللّٰهِ۔ (۷/۷۳)

یہ خدا کی اونٹنی ہے، جو خدا کی زمین میں چرے گی۔

اگر تم نے اسے اس طرح چرنے دیا، تو سمجھ لیا جائے گا کہ تم میرے تجویز کردہ معاشی نظام پر کاربند ہو گے۔ لیکن اگر تم نے اسے اس سے روکا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم اس تبدیلی کو گوارہ نہیں کر سکتے اور اپنی روش پر قائم رہنا چاہتے ہو۔

قوم کے سرمایہ داروں نے ماننے کو تو اسے مان لیا لیکن جب دیکھا کہ غریبوں کے مویشی اور ان کے جانور سب برابر کر دیئے گئے ہیں تو ان کے سینوں میں حسد و رقابت کی آگ بھڑک اٹھی ___ فَعَقَرُوْهَا۔ (۲۶/۱۵۷) انہوں نے غم و غصہ سے پاگل ہو کر اس اونٹنی کو مار ڈالا۔ (نیز ۵۴/۲۹، ۹۱/۱۴) ___ اور اپنے اسی سابقہ معاشی نظام کی طرف لوٹ گئے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا۔ (۹۱/۱۴) خدا کا قانون

مکافاتِ عمل ان پر روڈ رولر (ROAD ROLLER) کی طرح پھر گیا اور انہیں زمین کی سطح کے ساتھ ہموار کر کے رکھ دیا۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اسی طرح قوم مدین کی طرف، حضرت شعیبؑ مبعوث ہوئے۔ اس قوم کی معیشت گلہ بانی بھی تھی اور کاروباری بھی۔ ان کے زرعی نظام کی کیفیت کیا تھی؟ اس کا اندازہ حضرت موسیٰؑ کے اس واقعہ سے لگائیے۔ جو اس بستی سے باہر پیاؤ پر پیش آیا۔

حضرت موسیٰؑ جب مصر سے بھاگ کر مدین کے قریب آئے تو وہ سستانے کے لئے ایک چشمے کے قریب، درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ چشمے پر مویشی غٹاغٹ پانی پی رہے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جو پیاؤ سے دُور کھڑی ہیں۔ ان کے مویشی پیاس کے مارے تالاب سے باہر ہوئے جا رہے ہیں لیکن وہ انہیں چشمے کی طرف جانے سے روکتی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو اس پر تعجب ہوا کہ وہ انہیں پانی کی طرف جانے سے روکتی کیوں ہیں؟ چنانچہ ان کے دریافت کرنے پر لڑکیوں نے جواب دیا کہ

جب تک یہ چرواہے اپنی بکریوں کو پانی پلا کر نہ لے جائیں، ہم اپنی بکریوں کو پانی نہیں پلا سکتیں۔ (اس لئے کہ یہ لوگ بڑے بڑے جتھوں کے مالک اور صاحبِ قوت ہیں۔ اور ہمارے ہاں کوئی آدمی نہیں۔ صرف ایک باپ ہے جو بہت بوڑھا ہے۔ (۲۸/۲۳)

حضرت موسیٰؑ نے دل میں کہا کہ — ہر زمینے کہ رفتیم آسماں پیداست — مصر سے بھاگا تھا کہ وہاں فرعونیوں کی بالادست قوم نے بنی اسرائیل پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ یہاں پہنچا تو معاملہ وہاں سے بھی زیادہ الم انگیز نظر آیا۔ وہاں ایک قوم دوسری قوم کو تنگ کرتی تھی۔ یہاں ایک ہی قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو پانی کے چشمے کے قریب آنے نہیں دیتا۔ یہ جی میں کہا اور اٹھ کر ان غریب لڑکیوں کی بکریوں کو خود پانی پلا دیا۔ اور پھر درخت کے نیچے آکر بیٹھ گئے۔ اور گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ (۲۸/۲۴) کہ

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں؟

یہ تھی قوم مدین کی زرعی معیشت کی حالت۔ جہاں تک ان کی کاروباری زندگی کا تعلق ہے ان کی کیفیت وہی تھی جو ہر سرمایہ دار قوم کی ہوتی ہے۔ حضرت شعیبؑ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو ان سے کہا کہ۔

تمہیں چاہیئے کہ اپنے معاشی نظام میں عدل برتو۔ ماپ تول کو پورا رکھو۔ لوگوں کے حقوق و واجبات میں کمی نہ کرو۔ اور معاشرہ میں ہمواریاں پیدا ہو جانے کے بعد ناہمواریاں مت پیدا کرو۔ یہ سب کچھ تمہارے ہی بھلے کے لئے ہے، اگر تم یقین کرو تو۔ (۱۱/۸۵-۸۶)

دیکھو! ایسا نہ کرو کہ زندگی کے ہر راستے پر راہزن بن کر بیٹھ جاؤ اور جو لوگ صحیح نظامِ خداوندی کے قیام کیلئے اٹھیں، انہیں دھمکیاں دے دیکر اس راستے سے روکو اور اس راستے کی راہ میں پیچ و خم پیدا کرنے کے درپئے ہو جاؤ۔ (ز)

شروع شروع میں انہوں نے، حضرت شعیبؑ کی اس دعوت کو (SERIOUSLY) نہ لیا۔ اور ان سے صرف اتنا کہا کہ ـــــ اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۔ (۲۶/۱۸۵) "ہمیں ایسا نظر آتا ہے کہ تو بھی انہی میں سے ہے، جو اس فریب میں مبتلا ہو کر، کہ خدا ان سے باتیں کرتا ہے، قوم کے مصلح بننے کی کوشش کیا کرتے ہیں"۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ سمجھا کہ یہ ایک "مذہبی ریفارمر" ہے۔ اس لئے اسے، جس طرح یہ چاہتا ہے، اسی طریق پر صلوٰۃ (پوجا پاٹ) ادا کرنے دو۔ اس سے ہمارا کیا بگڑتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہدیا، کہ ہم تمہاری صلوٰۃ میں مزاحمت نہیں کریں گے۔ لیکن انہوں نے دیکھا کہ شعیبؑ کے نزدیک صلوٰۃ سے مفہوم پرستش نہیں، کچھ اور ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کہا کہ۔

يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ

اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا (۱۱/۸۷)

(تم جو کچھ کہتے تھے، اس سے ہم نے یہ سمجھا تھا کہ تم صرف پوجا پاٹ کا کوئی اپنا طریقہ لے کر آئے ہو۔ اس لئے ہم نے تجھ سے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ ہمارے ذہن میں تھا کہ ہم اپنے طریق پر پوجا پاٹ کرتے رہیں گے تم اپنے طریق پر کرتے رہو۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ معاملہ صرف پوجا پاٹ کا نہیں تیری صلوٰۃ صرف پرستش نہیں یہ تو ہماری روزمرہ کی عملی زندگی کے ان شعبوں میں دخیل ہو رہی ہے جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا تیری صلوٰۃ تجھ سے یہ کہتی ہے کہ ہم ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے اسلاف کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اور جس طرح ہمارا جی چاہے ہم دولت نہ اسطرح حاصل کریں اور نہ جس طرح ہمارا جی چاہے اسے خرچ کریں۔ ہماری معاشی زندگی تمہاری مرضی کے تابع چلے ـــــ یہ انوکھی سی "صلوٰۃ" ہے!

(ضمناً) آپ نے غور فرمایا کہ "مذہب" میں صلوٰۃ (نماز) کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ اور "دین" میں صلوٰۃ کا تصور کیا؟ دین کی رو سے صلوٰۃ کا نظام، قوم کے معاشی نظام کو بھی اپنے دائرے کے اندر لئے ہوتا ہے۔ اسی نظام کے قائم کرنے کا حکم قرآن نے دیا تھا۔

بہرحال، جب قوم نے دیکھا کہ معاملہ آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے اور یہ تحریک ہی کچھ اور ہے تو انہوں نے دھمکیاں دینی شروع کیں ـــــ قَالَ الْمَلَاُ

اس قوم کے سرمایہ دار طبقہ نے، جو قوت کے نشہ میں بدمست ہو رہے تھے، کہا کہ اے شعیبؑ ان باتوں میں سے ایک ضرور ہو گی ـــــ یا تو تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو پھر سے وہی قدیم مسلک اختیار کرنا ہو گا جسے چھوڑ کر وہ تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں، ورنہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو بستی سے نکال دیں گے۔ اب تم خود سوچ لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ (۷/۸۸)

قوم نے اپنی روش کو نہ چھوڑا اور اپنے غلط نظام کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئی۔ (۷/۹۱)

اور داستان صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰ تو ہے ہی ـــ ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری تینوں کے خلاف۔ بیک وقت دعوتِ مبارزت۔ فرعون، ملوکیت کے استبداد کا مجسمہ ـــ ہامان مذہبی پیشوائیت کی روباہ بازیوں کا نمائندہ ـــ اور قارون نظامِ سرمایہ داری کی ہوسِ خون آشامی کا پیکر۔ لیکن جہاں تک فرعون کا تعلق ہے، اس نے بھی اپنی مملکت کے استحکام کے لئے قوم کو معیشت کے نام پر ہی اپیل کیا تھا جب کہا تھا کہ

اے میری قوم کے لوگو! سوچو کہ کیا یہ نہریں جو میرے انتظام کے ماتحت جاری ہیں، اور جن پر تمہاری معیشت کا دار و مدار ہے، میری نہیں؟ (۴۳/۵۱)

یہ درحقیقت قوم کو بہت بڑی دھمکی دی گئی تھی کہ اگر تم میں سے کسی نے اس داعیِ انقلاب کا ساتھ دیا تو اس پر "نہروں کا پانی بند کر دیا جائے گا"

فرعون کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کے تصادم کی داستان الگ ہے اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ جہاں تک نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کشمکش کا تعلق ہے، قرآن کریم نے اس کے تذکرہ کی ابتداء ہی بڑے رمز آفریں انداز سے کی ہے جب کہا ہے کہ ـــ اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ۔ (۲۸/۷۶) ـــ فرعون تو ایک دوسری قوم کا آدمی تھا، جس نے بنی اسرائیل کو اپنی محکومیت کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا، لیکن قارون خود قومِ موسیٰؑ کا فرد تھا۔ یعنی نظامِ سرمایہ داری کی خون آشامی کی یہ حالت ہے کہ اس میں کوئی باہر سے آکر قوم کا خون نہیں چوستا۔ خود قوم کا ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو لوٹتا ہے۔ دوسری مصیبت یہ ہوتی ہے کہ غیروں کی غلامی کی لعنت ہر کوئی محسوس کرتا ہے اور کسی بدترین حکومت کے علاوہ، کوئی ان کا ہمنوا نہیں ہوتا۔ لیکن سرمایہ داروں کی عیش سامانیوں اور تن آسانیوں کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کے دل میں بھی ان جیسا بن جانے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ قرآن کریم بتاتا ہے کہ۔

ایک طرف وہ لوگ تھے جو قارون کو زندگی کی صحیح روش اختیار کرنے کی نصیحت کرتے تھے اور دوسری طرف وہ تھے جن کے پیشِ نظر زندگی کی عیش سامانیاں تھیں۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جب قارون کروّ فر اور شان و شوکت سے باہر نکلتا تو وہ بڑی حسرت سے کہتے کہ اے کاش! جو کچھ قارون کو ملا ہے، وہ ہمیں بھی مل جاتا۔ یہ بڑا ہی خوش نصیب ہے۔ (۲۸/۷۹)

جب قارون سے کہا جاتا کہ تم جو دوسروں کی محنت کی کمائی کو اس طرح غصب کر کے اتنی دولت اکٹھی کر رہے ہو، تمہیں اس کا کیا حق پہنچتا ہے؟ تو معلوم ہے وہ اس کا کیا جواب دیتا؟ وہی جواب جو ہر دور اور ہر قوم کے سرمایہ پرست کی طرف سے ملتا ہے وہ کہتا۔ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ ـــ (۲۸/۷۸) یہ دولت میں نے اپنی ہنرمندی اور چابک دستی سے حاصل کی ہے۔ اس لئے اس میں کسی دوسرے کا کیا حق ہے اور اس کی بابت مجھ سے کون باز پرس کر سکتا ہے؟

یہ کشمکش جاری رہی۔ اس کے بعد۔

جب قارون کی بدکرداریوں کے نتائج کے ظہور کا وقت آگیا۔ تو ہم نے اسے، اور اس کے مال و متاع سے بھرے ہوئے گھر کو تباہ کر دیا اور اس وقت کوئی گروہ ایسا نہ نکلا جو قانونِ خداوندی کے مقابلہ میں اس کی مدد کر سکتا، نہ ہی اس سے خود ہی ایسا ہو سکا کہ وہ اس تباہی سے بچ نکلتا۔ (سرمایہ دار کی اقبال مندی کے زمانے میں ایسا نظر آتا ہے کہ ایک لشکر ہے جو اس کی خاطر اپنی جاں تک قربان کر دے گا لیکن جب اس پر ادبار آتا ہے تو ایک شخص بھی اس کا ساتھ دینے والا نہیں ہوتا۔ نہ ہی اس کی اپنی ہنرمندی اسے اس تباہی سے بچا سکتی ہے۔ (۲۸/۸۱)

حضرت داؤدؑ کے زمانے میں عام معاشی نظام کس قسم کا تھا، اسے قرآن کریم نے ایک قصہ کی شکل میں بیان کیا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد اس پر ہے کہ بڑا سرمایہ، چھوٹی پونجی کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اور اس طرح امیر، امیر تر اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت داؤدؑ کے پاس ایک مقدمہ آیا جس میں:-

مستغیث نے کہا کہ فریقِ ثانی میرا اپنا بھائی ہے۔ لیکن دیکھو کہ یہ بھائی ہو کر میرے ساتھ کرنا کیا چاہتا ہے۔ اس کے پاس ننانوے دُنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دُنبی جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ امداد کرے، مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دُنبی بھی مجھے دیدے۔ چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحبِ اثر بھی۔ اس لئے باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں ـــــ یہ ہے میرے اس بھائی کا میرے ساتھ برتاؤ۔ آپ بتائیے کہ کیا اس کا یہ مطالبہ جائز ہے؟ (۳۸/۲۳)

یہ تھا وہ غلط معاشی نظام جس کی اصلاح کے لئے حضرت داؤدؑ مامور ہوئے تھے۔ چنانچہ خدا نے آپ سے کہہ دیا کہ

(تم بلاخوف و خطر، اطمینان سے معاشرہ کی اصلاح کرو۔) ہم نے تمہیں حکومت عطا ہی اس لئے کی ہے کہ تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے حق کے ساتھ کیا کرو۔ اور کسی کے خیالات اور جذبات کے پیچھے نہ لگو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ لوگ تمہیں راہِ راست سے بہکا دیں گے۔ (۳۸/۲۶)

مسیحِ انسانیت، حضرت عیسےٰؑ کی تو دعوت ہی ایک طرف "سود خوار یہودیوں" کے خلاف چیلنج، اور دوسری طرف رومیوں کی مستبد حکومت کے خلاف بغاوت تھی۔ لیکن سود خوار یہودی خود سامنے نہیں آتا تھا۔ جس طرح فرعون نے، مذہبی پیشوائیت (ہامان) کو حضرت موسےٰؑ کے خلاف اٹھا کھڑا کیا تھا۔ اسی طرح "

سرمایہ پرست یہودی ہیکل کے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کو آپ کے سامنے لے آئے تھے۔ اس آسمانی دعوت کی زد، ان مذہبی پیشواؤں پر کس طرح پڑتی تھی، اس کے متعلق انجیل برنباس کا ایک اقتباس درج کر دینا کافی ہوگا۔ اس انجیل کی فصل ۱۴۲ میں ہے۔

> تب ان لوگوں نے کاہنوں کے سردار کے خلاف مشورہ کیا اور کہا کہ اگر یہ آدمی بادشاہ ہو گیا تو ہم کیا کریں گے۔ البتہ ہم پر یہ بہت بڑی مصیبت ہوگی۔ اس لئے کہ وہ اللہ کی عبادت میں قدیم طریقے کے مطابق اصلاح کرنی چاہتا ہے۔ کیوں کہ وہ تقالید (رسومات) کو باطل کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ تب اس جیسے آدمی کی حکومت کے ماتحت ہمارا کیا انجام ہوگا۔ یقیناً ہم اور ہماری اولاد سب تباہ ہو جائیں گے اس لئے کہ ہم اپنی خدمت سے نکال دیئے جائیں گے تو ہم مجبور ہوں گے کہ اپنی روٹی خطیرے کے طور پر مانگیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہبی پیشوائیت جہاں بھی ہو، اس کا مسئلہ مذہبی نہیں ہوتا، معاشی ہوتا ہے۔ اور چونکہ دینِ خداوندی کسی ایسے شخص کو برداشت نہیں کر سکتا جو کوئی تعمیری کام کئے بغیر، دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائے، اس لئے مذہبی پیشوائیت کی اس میں گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ یہ وجہ تھی کہ ہیکل کے احبار و رہبان، حضرت عیسیٰؑ کی اس انقلاب آفریں دعوت کی اس شدت سے مخالفت کرتے تھے۔

جب حضور خاتم الانبیاءؐ کی وساطت سے دین اپنی آخری اور مکمل شکل میں نوعِ انسانی کو دیا گیا تو نظام سرمایہ داری کے حاملین کی طرف سے اس کی مخالفت بھی اپنی انتہائی شدت تک پہنچ گئی۔ ہمارے ہاں کے مروجہ اسلام کی رُو سے، جو ہمارے دورِ ملوکیت اور جاگیرداری کا وضع کردہ اور مذہبی پیشوائیت کے سہارے قائم ہے، نبی اکرمؐ کی بعثتِ مقدسہ کا مقصد صرف اتنا ہی بتایا جاتا ہے کہ عہدِ جاہلیت میں عربوں میں شراب خواری، جوئے بازی، باہمی جنگ و جدال، توہمانہ رسومات عام تھیں۔ حضورؐ ان قبیح رسومات کی اصلاح کے لئے تشریف لائے تھے۔ وہ لوگ بت پرست تھے اور آپؐ اسے شرک قرار دیتے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ قریشِ مکہ اور ان کے ساتھ جملہ قبائلِ عرب نے جو اس دعوت کی مخالفت میں جانوں تک کی بازی لگا دی تھی تو کیا اس کی وجہ محض اتنی تھی کہ وہ ان عادات و رسومات کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ جو عام اخلاقی اصولوں کی رُو سے بھی قابلِ مذمت اور درخورِ نفرت تھیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کی بت پرستی کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ تو اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہی قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو تاکید کر دی تھی کہ ان کے معبودوں کو گالی مت دو۔ لہٰذا، ان کے اندازِ تبلیغ میں اشتعال انگیزی کا عنصر موجود ہی نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ مسلمان غیر مسلموں کو ان کے مذہب سے (خواہ وہ بت پرست ہی کیوں نہ ہو) زبردستی روک نہیں سکتے تھے۔ تو پھر وہ کون سی بات تھی جس کی وجہ سے یہ سارا ملک اس دعوت کے خلاف میدانِ کارزار میں اتر آیا تھا۔ بالخصوص جب یہ جماعتِ مومنین مکہ چھوڑ کر مدینہ چلی آئی تھی تو پھر قریش کو کس بات کا خطرہ تھا جو انہوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔

اور چھ سات سال تک مسلسل، معرکہ آرائیاں ہوتی رہیں۔

اس سوال کا جواب، ہمارا مروّجہ مذہبی طبقہ دے نہیں سکتا۔ اس کا جواب، البتہ، ایک غیر مسلم نے دیا ہے جس نے تاریخ کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کیا تھا۔

بات یوں ہوئی کہ جب چین میں امریکہ کے پٹھو، چیانگ کائی شک، کو کمیونسٹوں کے ہاتھوں بُری طرح شکست ہوئی تو اس سے امریکہ کو جس قدر خفت اٹھانی پڑی وہ ظاہر ہے۔ اہل امریکہ حیران اور متعجب تھے کہ ان کی اس قدر امداد کے باوجود چیانگ کائی شک اس طرح خاسر و نامراد کیوں رہ گیا۔ اس کی (یا خود اپنی سیاست کی) اس ناکامی کی وجہ دریافت کرنے کے لئے اکثر امریکی دیدہ ور چین پہنچے۔ ان میں ایک نامور جرنلسٹ (JACK BELDEN) بھی تھا۔ اس نے وہاں کی سیاحت کے بعد ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا (CHINA SHAKES THE WORLD) وہ اس کتاب کے پیش لفظ میں لکھتا ہے کہ تاریخ کے اس تحیر انگیز واقعہ (یعنی انقلابِ چین) کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے۔

> نہ تو حکومتِ امریکہ اور امریکی پریس، نہ ہی امریکہ کے عوام اور ان کے وہ نمائندے جو مشرقِ بعید کے قونصل خانوں میں بیٹھے ہیں، نہ کاروباری حلقہ اور نہ ہی فوجی ادارے اپنی نگاہ کو اپنے ذاتی یا قومی مفاد کی تنگ وادی سے آگے لے جاتے ہیں تاکہ وہ اہل چین کے درد آگیں اور جذبات سے لبریز قلوب تک پہنچ سکیں۔

اس کے بعد بیلڈن اس انقلابِ عظیم کی حقیقی وجہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

> ان تمام لوگوں کو، جو اس انقلاب کی صحیح علت معلوم کرنا چاہتے ہیں، محمدؐ کے ان الفاظ کی یاد دلا دینا چاہیئے جو وہ مکہ کے تاجروں سے کہا کرتے تھے کہ۔
>
> كَلَّا ۔ بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۔ وَ لَا تُحٰضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۔ (۸۹/۱۷، ۱۸)
>
> نہیں! تمہاری تباہی کی وجہ وہ نہیں جو تم سمجھے بیٹھے ہو۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم اس شخص کو واجب التکریم نہیں سمجھتے تھے جو معاشرہ میں تنہا رہ جائے اور ایک دوسرے کو اس شخص کی روٹی مہیا کرنے کی تلقین نہیں کرتے تھے جس کی چلتی گاڑی رُک جائے۔

یہ تھا آپؐ کا وہ انقلاب آفریں پیغام جس کی وہ لوگ مخالفت کرتے تھے۔ آپؐ، ان کے پورے کے پورے معاشرتی اور معاشی نظام کو بدلنا چاہتے تھے۔ قریش بہت بڑے تاجر تھے۔ اتنے بڑے کہ (قرآن کے الفاظ میں)

رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّيْفِ ۔ (۱۰۶/۲)

ان کے کاروانِ تجارت، سردی، گرمی، سارا سال۔ رواں دواں رہتے تھے۔

ایک طرف تجارت، اور دوسری طرف کعبہ کی تولیت۔ اس سے ان کا پورا معاشی نظام، سرمایہ داری پر متفرع تھا۔

اور اس داعیِ انقلاب کا پیغام، اس نظام کو ختم کرنے کا مدعی تھا۔ وہ اس کی اس طرح مخالفت نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ ان سرمایہ داروں کے سب سے بڑے نمائندہ، ابوجہل نے، جب غلافِ کعبہ کو تھام کر اس تحریک جدید کے خلاف اپنے معبودوں سے فریاد کی ہے تو اس میں اُس نے کہا یہ تھا کہ یہ پیغام وہی ہے جو فارس میں ابھی ابھی مزدکؒ لایا تھا۔ محمدؐ کو یہ سبق (معاذ اللہ) سلمان پارسیؓ نے پڑھایا ہے۔

ایں مساوات، ایں مواخات اعجمی است
خوب می دانم کہ سلمان مزدکی است

انہوں نے حضورؐ سے مفاہمت کی صورت پیدا کرنے کے لئے اپنا جو نمائندہ بھیجا تھا۔ اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا ۔ (۷۴/۱۲) اسے بڑی فراواں دولت حاصل تھی۔ ان مخالفین سے جب کہا گیا کہ یاد رکھو! اگر تم نے اپنی روش کو نہ چھوڑا تو تمہارا حشر بھی وہی ہوگا جو تم سے پہلے تمہارے جیسی قوموں کا ہوا تھا۔ وہ تم سے بھی زیادہ مال و دولت اور قوت و حشمت کی مالک تھیں ان کی بڑی بڑی بستیاں تھیں (۹/۷۰)، جن کے اب صرف کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ ([illegible]) اس لئے تم جو اپنے مال و دولت پر اتراتے ہو، تو تمہارا انجام بھی انہی جیسا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ خدا کا اٹل فیصلہ ہے کہ

جو شخص مال اور دولت جمع کرتا ہے اور پھر نمائش کے پھیر میں پھنس جاتا ہے۔ تو اس کا انجام تباہی ہوتا ہے۔ ([illegible])

تم "ربِ کعبہ" کی طرف نسبت رکھنے سے اس قدر مفاد حاصل کرتے ہو کہ نہ تمہیں بھوک کا ڈر ستاتا ہے نہ کسی قسم کا خوف و خطر لاحق ہے۔ تو تمہیں چاہیئے کہ محکومیت بھی اسی رب کی اختیار کرو۔ ([illegible]) لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور اپنی مخالفت میں تیز سے تیز ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ جب ان کی ہلاکت پر ان کے انجام کی مہرِ تصدیق ثبت ہوگئی تو قرآن کریم نے ان کے نمائندہ (ابولہب) کا نام لے کر، ان کی تباہی کے سلسلے میں کہا کہ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۔ (۱۱۱/۲) اس کا اس قدر مال و دولت جو اس نے حاصل کر رکھا تھا، اس کے کسی کام نہ آیا۔"

"قرآن کا معاشی نظام" سردست میرا موضوع نہیں۔ میں اس عنوان پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔ قرآن کریم کا مطالعہ اس نگاہ سے کیا جائے، تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام، نظامِ سرمایہ داری کے خلاف کھلا ہوا چیلنج ہے اور جو دین (نظامِ زندگی) وہ پیش کرتا ہے، اس کی مخالفت کے اقنوم ثلاثہ (ملوکیت، مذہبی پیشوائیت، اور سرمایہ داری) میں، سرمایہ داری کو برابر کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ

(اس باب میں ایک اصولی حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھو۔ اور وہ یہ کہ) کوئی قوم اور بستی ایسی نہ تھی کہ اس میں ہم نے اپنے رسول کو بھیجا ہو جو انہیں ان کی غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کرتا تھا۔ اور وہاں کے آسودہ حال، دولت مند سرمایہ دار طبقہ (مترفین) نے اسکی مخالفت نہ کی ہو۔

وہ کہتے یہ تھے کہ ہمارے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے اور ہمارا جتھہ بھی بہت بڑا ہے۔ اس لئے کس کی مجال ہے جو ہمارا بال بھی بیکا کر سکے۔ (۳۴/۳۵)

یعنی اُس وقت تک جو بات جزءً جزءً بیان ہو رہی تھی، قرآن کریم نے اسے ایک کلیہ کی حیثیت سے، بیان کر کے، دین اور نظامِ سرمایہ داری کے باہمد گر متضاد اور نقیض ہونے کی حتمی شہادت ہم پہنچا دی۔ یعنے خدا کی طرف سے جہاں اور جب بھی دین آیا، مترفین نے اس کی مخالفت کی۔ اس میں کوئی استثنیٰ نہیں۔ ہر جگہ اور ہر زمانے میں ایسا ہی ہوا۔ ان کے پاس ان کی اس مخالفت کی دلیل فقط یہ ہوتی تھی کہ نظامِ سرمایہ داری ہمارے آباؤ اجداد سے متواتر چلا آ رہا ہے۔ ہم اس سے ہٹ نہیں سکتے۔

اور اسی طرح ہم نے کسی بستی میں اپنا رسول نہیں بھیجا کہ وہاں کے دولت مند طبقہ (مترفین) نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے اسلاف کو جس راستے پر چلتے دیکھا ہے، ہم اس راستے سے ایک قدم بھی اِدھر اُدھر ہٹنے کے لئے تیار نہیں۔ (۴۳/۲۳)

سورۃ "انبیاء" میں ان لوگوں کے انجام کو بڑے ڈرامائی انداز میں سامنے لایا گیا ہے۔ جہاں قرآن کی مخاطب قوم سے کہا گیا ہے کہ

اگر تم نے اپنی زندگی کا نقشہ قرآن کے مطابق مرتب کر لیا تو تمہیں عظمت اور بلندی حاصل ہو جائے گی۔ اگر اس کے خلاف چلے تو تم بھی اسی طرح تباہ ہو جاؤ گے جس طرح تم سے پہلے کتنی ایسی قومیں تباہ ہو گئیں جنہوں نے ظلم اور ناانصافی پر کمر باندھ رکھی تھی۔ وہ تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔

ان کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں ان کے انجام سے آگاہ کیا جا رہا تھا کہ وہ اس روش سے باز آ جائیں۔ لیکن وہ اس تنبیہ پر کان نہیں دھرتے تھے۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے حتیٰ کہ جب وہ محسوس طور پر سامنے آ گئے تو وہ اس تباہی سے بچنے کے لئے لگے بھاگنے۔

لیکن اس وقت بھاگنے کا کونسا موقع تھا۔ چنانچہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو۔ مت بھاگو۔ اب اُلٹے پاؤں اپنی اپنی عیش سامانیوں کی طرف چلو (مَا اُتْرِفْتُمْ فِيهِ) جن کی سرشاریاں تمہیں اس قدر مدہوش کئے ہوئے تھیں۔ اور اپنے ان محلات کی طرف پلٹو جن کے اندر تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ تصور کیا کرتے تھے۔ وہاں چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا۔؟ (۲۱/۱۱-۱۴)

قوموں کی تباہی کے سلسلہ میں قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جب کسی قوم کی بربادی کے دن قریب آ جاتے ہیں۔ تو

اس کا سرمایہ پرست طبقہ ہوسِ زر اندوزی میں حدود فراموش ہو جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ

ذہنیت اس قوم پر بڑی طرح مسلط ہوتی ہے اور وہ صحیح روشِ زندگی کو چھوڑ کر غلط راہیں اختیار کر لیتی ہے۔ تو پھر وہ اس طرح ہلاک ہو جاتی ہے کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہتا۔ (۱۷/۱۶)

سورۂ ھود میں ہے کہ تم اقوامِ گذشتہ کے احوال و کوائف پر نگاہ ڈالو اور دیکھو کہ اس سے تم کس نتیجہ پر پہنچتے ہو۔ کیا اس نتیجہ پر نہیں کہ۔

جو لوگ تباہی سے بچ جاتے، ان میں سے بجز معدودے چند ایسے رہ جاتے جو اپنے مفاد کو قوانینِ خداوندی کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور لوگوں کو ناہمواریاں پیدا کرنے سے روکتے ورنہ باقیوں کا تو یہ حال ہو جاتا کہ وہ اپنی تن آسانی اور مفاد پرستی کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لیا کرتے، تاکہ ان کی عیش سامانیوں میں فرق نہ آنے پائے۔ (خواہ باقی انسانوں پہ کچھ ہی کیوں نہ گزرے) یہ تھے ان کے وہ جرائم جن کی بنا پر ان کی بربادی ہوتی۔ (۱۱/۱۱۶)

قوموں کی تباہی کے وقت سب سے زیادہ عذاب اسی سرمایہ دار طبقہ پر وارد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ انہی کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جس کے لٹنے کا انہیں ڈر ہو۔

حَتّٰۤى اِذَاۤ اَخَذْنَا مُتْرَفِیْهِمْ بِالْعَذَابِ اِذَا هُمْ یَجْــَٔرُوْنَ۔

تاآنکہ اس قوم کا مرفہ الحال، سرمایہ دار طبقہ عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے، اور وہ کس بُری طرح سے چیختا چلاتا ہے۔ (۲۳/۶۴)

قرآن کریم کی تصریحات آپ کے سامنے آ چکیں۔ ان سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ دینِ خداوندی کی رُو سے سرمایہ پرستی کی پوزیشن کیا ہے۔ لیکن اگر آپ کو اب بھی کسی قولِ فیصل کا انتظار ہے تو اُسے بھی سُن لیجئے۔ جہنم کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور اس میں پڑے ہوئے لوگ چیخ چلا رہے ہیں۔ پوچھنے والا پوچھتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں اور انہوں نے کیا جرم کیا تھا جو یہ اس قدر شدید عذاب میں مبتلا ہیں؟

سوال آپ نے سن لیا۔ اب جواب ملاحظہ فرمائیے۔ کہا کہ

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِیْنَ۔ (۵۶/۴۶)

یہ سابقہ سرمایہ داروں کا طبقہ ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔

طلوعِ اسلام نہ ملنے کی شکایت۔ شکایت موصول ہونے پر پندرہ تاریخ تک پرچہ دوبارہ ارسال کیا جا سکے گا۔ اس کے بعد اطلاع آنے پر (اگر موجود ہوا تو) قیمتاً بھیجا جائے گا۔ خط و کتابت میں نمبر خریداری کا حوالہ ضروری ہے۔

(ناظم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور)

ادارۂ طلوعِ اسلام کی مطبوعات کی ترمیم شدہ قیمتیں

(نوٹ) ان قیمتوں میں پیکنگ و ڈاک کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن ۔ (پارہ اول)	۳/۵۰ روپے
〃 〃 (پارہ ۲ تا ۲۷) فی پارہ	〃 ۲/۲۵
〃 〃 (پارہ ۲۸، ۲۹، ۳۰) یکجا	〃 ۶/۵۰
〃 〃 (پارہ ۳۰)	〃 ۴/۵۰
〃 〃 (جلد اول و دوم) فی جلد	〃 ۳۰/-
〃 〃 (جلد سوم)	〃 ۳۵/-
مکمل سیٹ	〃 ۹۰/-
لغات القرآن (جلد اول تا چہارم) فی جلد	〃 ۲۰/-
مکمل سیٹ	〃 ۸۰/-
اسلام کیا ہے؟ (اعلیٰ)	〃 ۱۰/-
اسلام کیا ہے؟ (سستا)	〃 ۶/-
ابلیس و آدم ۔ جوئے نور ۔ برقِ طور (فی جلد)	〃 ۱۵/-
انسان نے کیا سوچا؟	〃 ۱۵/-
معراج انسانیت	〃 ۲۵/-
کتاب التقدیر	〃 ۱۵/-
بہارِ نو	〃 ۵/-
سلسبیل ۔ فردوسِ گم گشتہ (فی جلد)	〃 ۱۰/-
قائداعظم کے تصور کا پاکستان	〃 ۱۲/-
مقام حدیث	〃 ۵/-
اسلامی معاشرت	〃 ۴/-
اسباب زوالِ امت	〃 ۲/-
جہاد	〃 ۲/۵۰
قرآنی قوانین واقتدار	۴/- روپے
قرآنی فیصلے ۔ (جلد اول ۔ دوم ۔ سوم) فی جلد	〃 ۵/-
مکمل سیٹ	〃 ۱۵/-
سلیم کے نام ۔ (جلد اول ۔ دوم ۔ سوم) فی جلد	〃 ۱۰/-
مکمل سیٹ (تین جلدیں)	〃 ۳۰/-
طاہرہ کے نام	〃 ۶/-
عربی خود سیکھیئے	〃 ۹/-
منزل بہ منزل	〃 ۸/-
جہانِ فردا	〃 ۸/-
ISLAM, A CHALLENGE TO RELIGION (مجلد)	〃 ۳۰/-
ISLAM, A CHALLENGE TO RELIGION (پیپر بیک)	〃 ۲۰/-
الفتنۃ الکبریٰ (طٰہٰ حسین)	〃 ۸/-
فجر الاسلام (جلد اول ۔ دوم) فی جلد	〃 ۵/-
اسلام پر کیا گذری؟ (از علامہ دین مصری)	〃 ۸/-
قتلِ مرتد ۔ غلام اور لونڈیاں	〃 ۲/-
دھتکارے ہوئے انسان (عنایت اللہ)	〃 ۵/-
جمع القرآن ۔ (علامہ تمنا عمادی مرحوم)	〃 ۲/۵۰
تاریخ الامت (علامہ اسلم جیراجپوری مرحوم)	
(جلد اول تا چہارم) فی جلد	〃 ۳/-
جلد پنجم و ششم (فی جلد) -/۴ روپے جلد ہفتم و ہشتم (فی جلد)	〃 ۳/-
مکمل سیٹ	〃 ۲۵/-
PHENOMENA OF NATURE AND QURAN ڈاکٹر سید عبدالودود	〃 ۲۵/-

مکتبہ دین و دانش، چوک اردو بازار ۔ لاہور ٦ ادارہ طلوع اسلام ۔ ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور